نشانِ راہ

مظہر الدین

حجازی سنز پبلشرز، میکلوڈ روڈ۔ لاہور
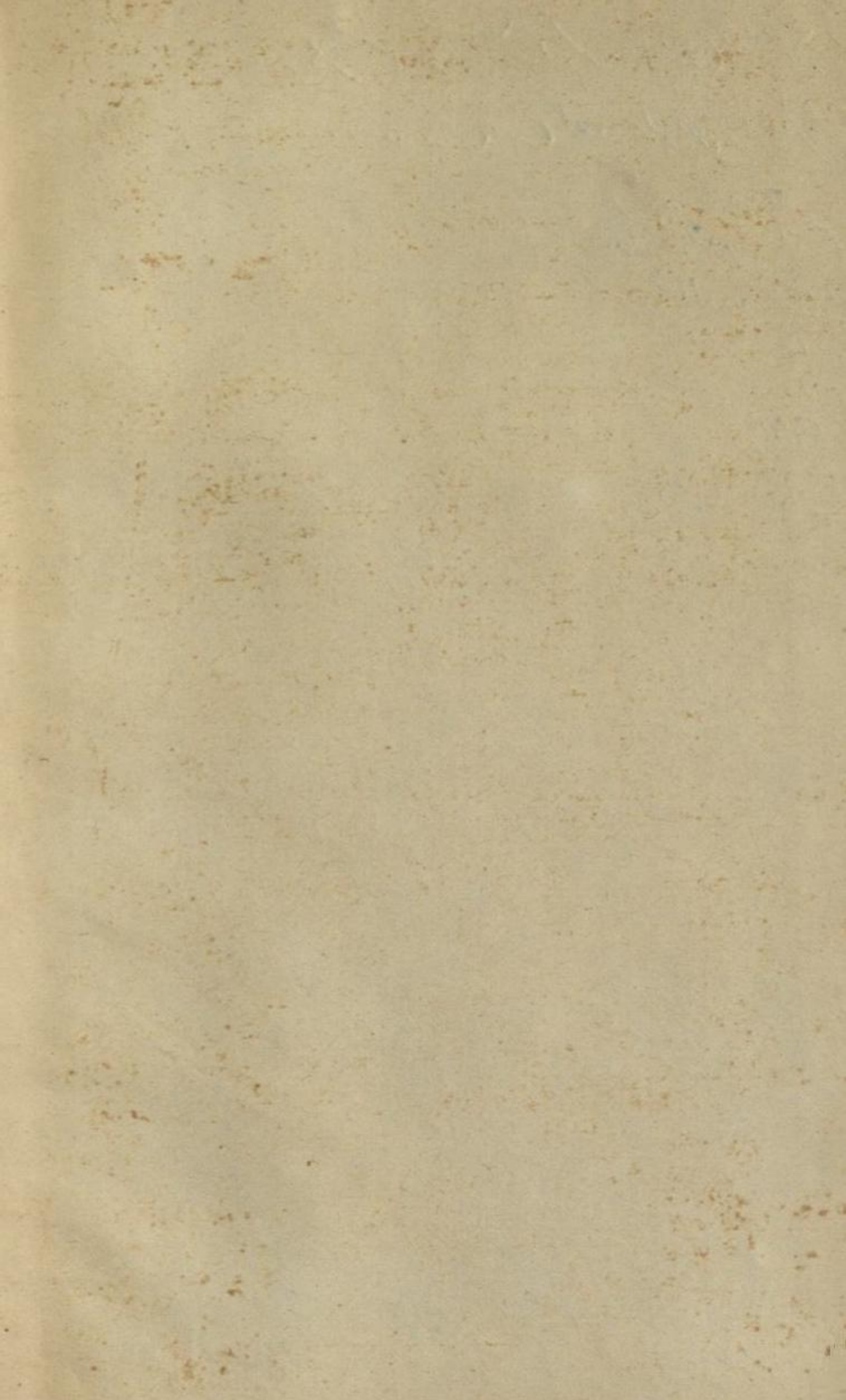
نشانِ راہ

مظہرالدین
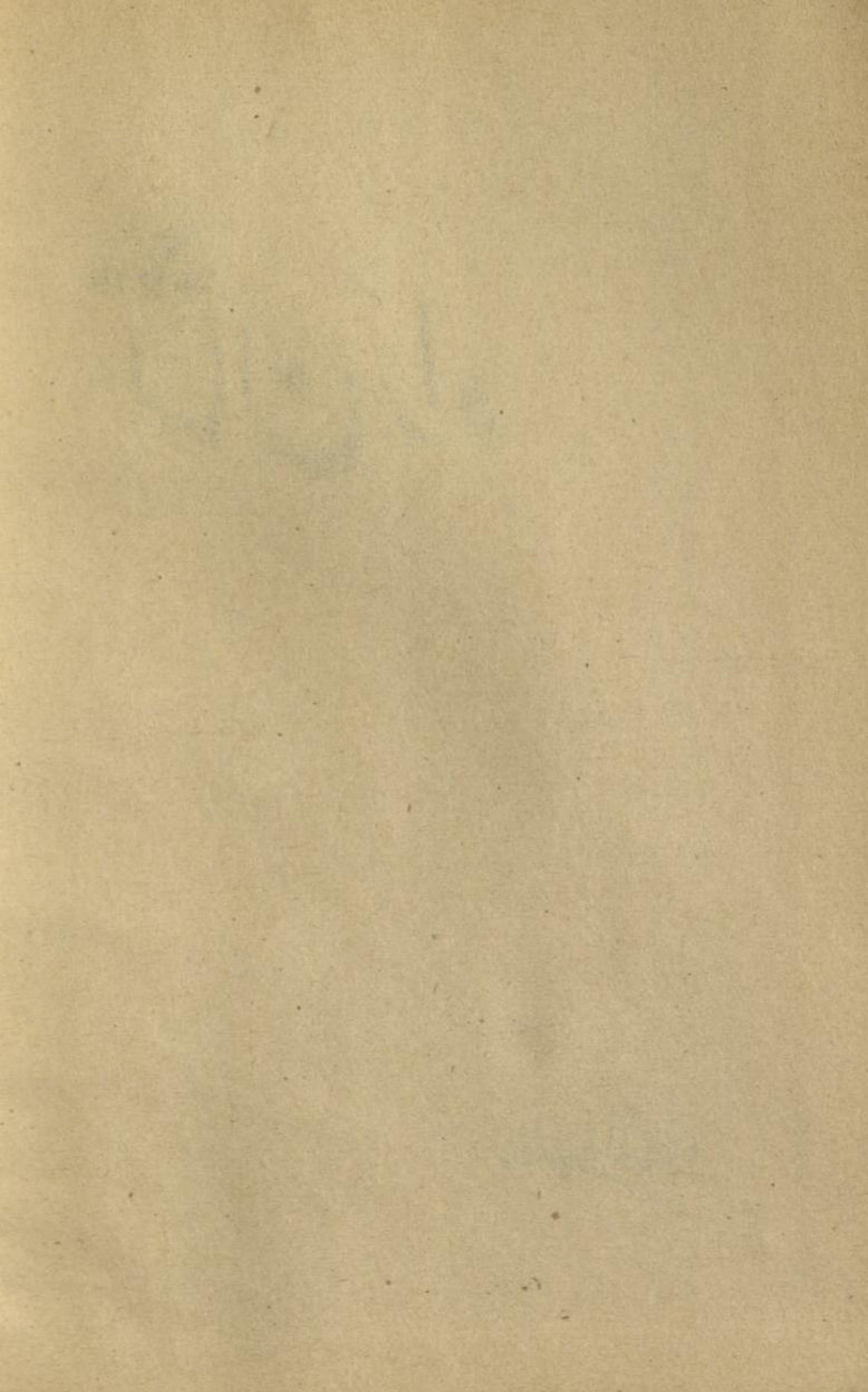
الحاج کیپٹن منظور الحق

کے نام ———

جن کا عِشق میری منزل کا رہنما ہے

گُل آورد سعدیؔ سوئے بوستاں

بار: اوّل

تعداد: ۲۰۰۰

قیمت: ۵ روپے ۴ آنے

جلد اوّل

حجازی سنز پبلشرز، میکلوڈ روڈ - لاہور
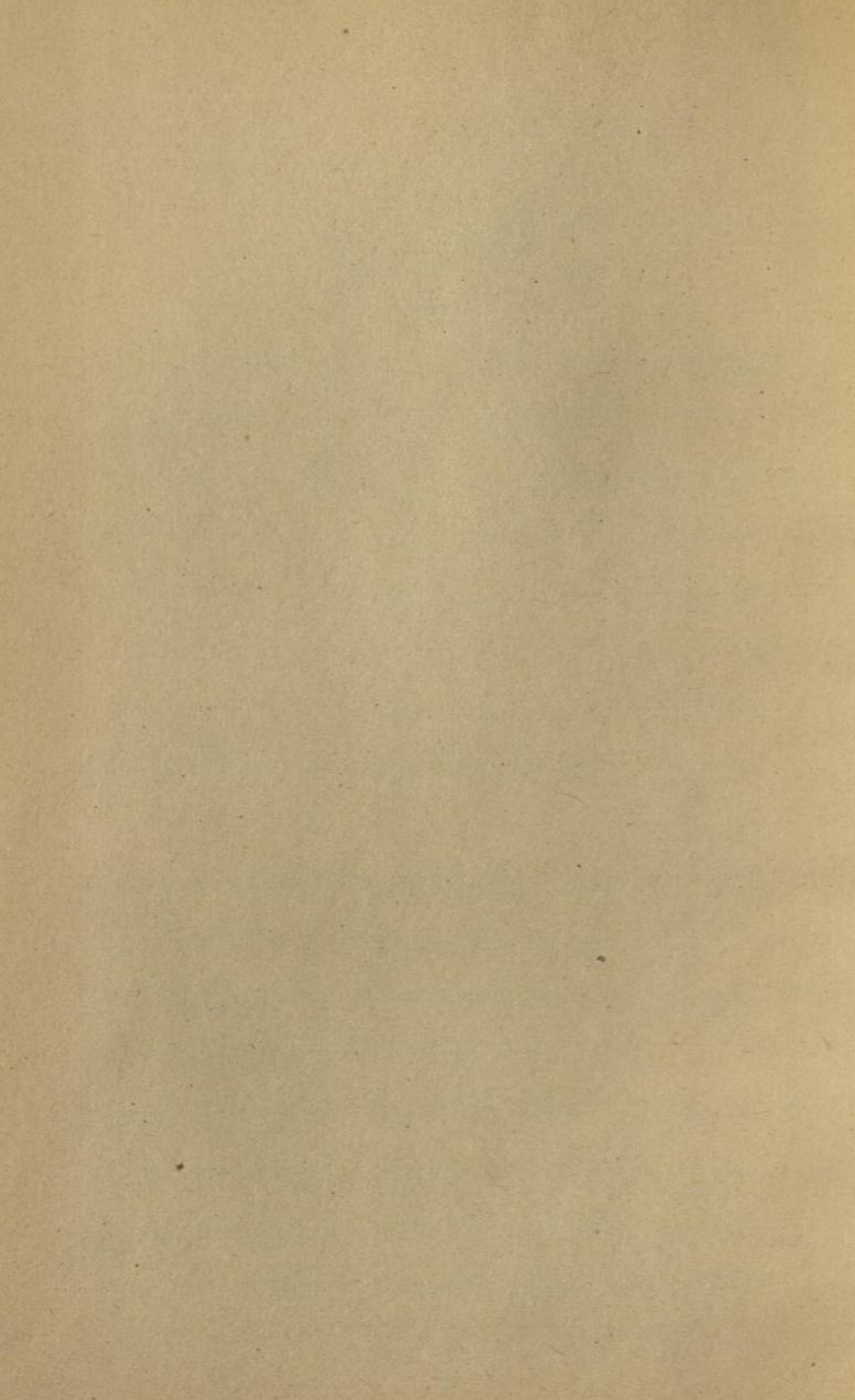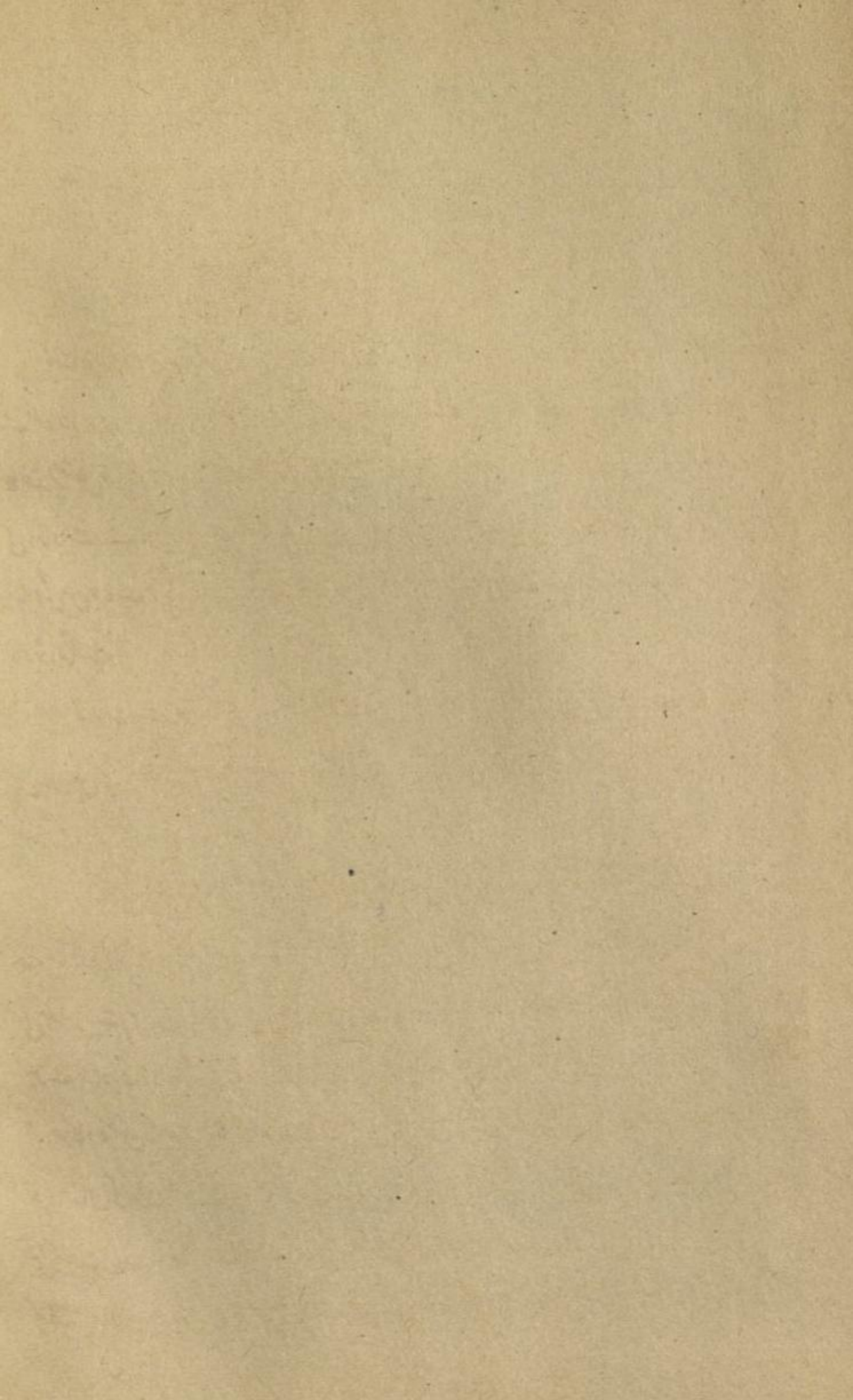
پیش لفظ

"نشانِ راہ" میرے ان مضامین کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو میں ابتداء ہی سے "کوہستان" کے لئے لکھ رہا ہوں۔ یہ مضامین چونکہ کسی خاص سکیم کے تحت نہیں لکھے گئے۔ من سے جو موج ابھری وہ کاغذ پر منتقل ہو گئی، اسی لئے ان کی ترتیب میں کوئی التزام نہیں برتا گیا ——— ترتیب و تنظیم کی افادیت سے انکار نہیں اور نہ ہی میں اس کا منکر ہوں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات سادگی میں جو بات ہوتی ہے وہ تکلف میں نہیں ہوتی۔ سادگی لوٹ لیتی ہے اور بے ساختہ پن مار ڈالتا ہے۔

قدرت کے جو مظاہر دریاؤں، پہاڑوں اور صحراؤں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں کوئی تکلف اور تصنع نہیں، سادگی ہی ان کا حسن کہلاتی ہے اور بے ساختگی ہی نے انہیں متنوع اور دل پذیر بنایا ہے۔

دریا کی موجیں اگر الٹی ٹیڑھی نہ ہوتیں تو شاید اتنی حسین و دلآویز نظر نہ آتیں۔ نشیب و فراز ہی نے پہاڑوں کو عظمتیں بخشی ہیں۔ پستیاں اور بلندیاں ہی ان کے جلال و جبروت کی آئینہ دار ہیں۔ صحراؤں کی معصومیت ہی ان کی دل کشی کی غماز کہلاتی ہے، ستارے لاکھ حسین و دلآویز سہی لیکن اگر یہ بکھرے ہوئے نہ ہوتے اور انہیں کسی خاص سلیقے اور قرینے سے سجایا جاتا تو منزل شب کے ان مسافروں کے خرام کا وہ حسن ظاہر نہ ہوتا جو فطرت کے پیش نظر تھا اور جسے قدرت انہیں بکھیر کر ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ خود انسان کی اپنی طبیعت کا یہ عالم ہے کہ اسے کسی حال پر قرار نہیں۔ احوال و تغیرات ہمیں نت نئی کیفیتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ شادی و غم، رنج و راحت، کیف اور بے کیفی اور اس نوع کی دوسری کیفیتیں ہماری اثر پذیری کا نتیجہ ہیں اور انہی سے حیات کا دامن رنگین نظر آتا ہے۔

گہ گریم و گہ خندم چوں طفل بخواب اندر

طفل خواب میں ان کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے اور ایک حساس اور حالات و واقعات سے غیر معمولی اثر قبول کرنے والا انسان بیداری ہی میں ان لذتوں کو محسوس کرتا ہے اور میری یہ تحریریں اور جذبات و خیالات کی تصویریں اسی اثر پذیری کا نتیجہ ہیں۔ بہت ممکن تھا کہ میرے ان مضامین کے اشاعت پذیر ہونے میں دیر ہو جاتی اور یہ اشاعت پذیر ہو کر منصۂ شہود پر نہ آتے لیکن بعض احباب کا خلوص انہیں کھینچ لایا ہے۔ ان کرم فرماؤں میں چوہدری نذیر احمد سابق اٹارنی جنرل۔ راجہ احمد علی خاں سابق پارلیمانی سیکرٹری، اردو کے مشہور صوفی شاعر یوسف ظفر اور ملک رحیم بخش بچہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان احباب کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مضامین کے تراشے بھیج کر مجھے اس قابل بنایا کہ میں انہیں موزوں صورت دے سکوں۔ ایک بھارتی ہندو ریڈر دھرم پال کی شکرگزاری کے لئے تو الفاظ نہیں ملتے جنہوں نے بھارت سے بہترین صورت میں مضامین کا انتخاب بھیج کر میری بہت بڑی مشکل حل کر دی۔

آخر میں اپنے قارئین کرام سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکان اُمت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم :

نیاز مند :۔ مظہر الدین

۱۶ نومبر ۱۹۶۴ء راولپنڈی

عبودیت کی تکمیل

ذرّوں سے لے کر ستاروں تک کی دنیا انسان کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ یہ ماہ و سال کی گردشیں، طلوع و غروب کے دل کش مناظر، صبح و شام کے حسین و دلآویز جلوے، موسمی تغیرات، سردی اور گرمی کی لذتیں، بہار و خزاں کی ندرت کاریاں، پستی و بلندی کی حیرت آفرینیاں، صحراؤں کا سکوت، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی ایستادگی، جبروت مندی اور اسی نوع کی ہزاروں دلچسپیاں اور طلسم بندیاں بلا فائدہ نہیں، کائنات کی کوئی چیز بھی بیکار پیدا نہیں کی گئی۔ ہر ایک کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے، جس چیز پر بھی نظر ڈالی جائے، وہ انسان کی خدمت میں مصروف نظر آتی ہے انسان کے لیے فائدہ مند اور مفید ہے۔ لیکن انسان ان میں سے کسی کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ اس کی تخلیق کا مقصد سب کی تخلیق سے جداگانہ اور مختلف ہے۔ انسان کو کائنات سے الگ کر دیا جائے تو ستاروں کے خرام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ماہ و شہاب کی طلعتیں کم نہ ہوں گی، سورج کی روشنی بدستور ضیاء بار رہے گی۔ ہواؤں کا خرام اسی طرح تموج آفریں رہے گا۔ قدرت کے یہ تمام کارندے

جو مختلف شیون و مظاہر کی صورت میں کائنات کے حسن و جمال میں اضافے کا موجب ثابت ہو رہے ہیں، اپنے فرائضِ حیات میں کوئی کوتاہی نہیں برتیں گے۔ ان کی حرکت کم نہ ہوگی، جو فریضہ جس کے سپرد ہے، اس میں کوتاہی نہیں برتے گا، لیکن ان میں سے ایک چیز بھی اگر کم کر دی جائے تو کائنات کی وہ دلچسپی قائم نہیں رہ سکتی، جو ان مظاہرِ فطرت کی وجہ سے قائم و دائم ہے۔ صاف ظاہر ہے یہ تمام ندرت آفرینیاں اور ندرت کاریاں صرف انسان کے ذوقِ جمال کو تسکین دینے کے لیے۔ اور اس کی حیات خیابانوں کو نئی بہاریں عطا کرنے کے لیے معرضِ وجود میں لائی گئی ہیں۔ لیکن انسان کو صرف عبودیت کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ مظاہر پرستی کا مفہوم تو یہ ہوگا کہ آقا غلام کے سامنے جھک رہا ہے مخدوم خادم کے سامنے سجدہ ریزیاں کر رہا ہے۔ جن چیزوں کو اس کی غلامی کے لیے پیدا کیا گیا تھا، یہ انہی کو معبود جان کر ان کے سامنے جھک رہا ہے، حاشا و کلا انسانی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہو سکتا۔ تمام مظاہر قدرت کو انسان کی غلامی میں اسی لیے لگایا گیا ہے کہ وہ اپنی تخلیق کا مقصد سمجھے جو ذات ہواؤں کو کنٹرول کر رہی ہے، جس نے ستاروں کو دلآویزیاں بخشی ہیں، ابر بہاری کو برسنے اور مردہ زمین کو نئی زندگی عطا کرنے کی قوت سے نوازا ہے سبزے کو روئیدگی کی صلاحیت بخشی ہے۔ پھولوں کو تبسم عطا کیا ہے، اور

ہر چیز کی ضرورت کی تکمیل کا ذمہ لیا ہے، وسائل کے نہ ہونے کے باوجود وہ روزی عطا کرنے پر قادر ہے۔ اس کا خوانِ کرم اتنا غیر محدود، اتنا وسیع اور حکمتوں سے لبریز ہے کہ انسانی ذہن اپنی تمام تر طرفہ کاریوں کے باوجود اس کی لامحدود وسعتوں کو نہیں پا سکتا۔ اسی قادر و قیوم ذات کو اپنا مالک و مختار سمجھے، اور اسی کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار کرے۔ آفتاب و مہتاب کا غروب ان کی ناپائیداری کی دلیل ہے، پہاڑوں کی ایستادگی ان کی بے چارگی کی علامت ہے۔ غرض مظاہر فطرت میں سے کوئی چیز بھی قائم رہنے والی نہیں۔ ان کی بے چارگی اور تغیر ان کی فنا پذیری کی علامتیں ہیں۔ قائم و دائم رہنے والی صرف وہی حی و قیوم ذات ہے جب کچھ نہ تھا تو اپنی تمام تر قدرتوں کے ساتھ موجود تھی، جب کچھ نہ ہوگا تو اس کی عظمتیں آشکارا ہوں گی۔ یہ کارخانۂ قدرت صرف انسان کی عبودیت کے اعتراف و اظہار کے لیے ہے جب تک اس کی زبان پر حمد کے ترانے رہیں گے اس کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز ہوگا اور اس کی جبیں اس کے آستانۂ جلال و جبروت پر سجدہ ریزیاں کرتی رہے گی۔ کائنات کی ندرت کاریوں میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اس کا جلال بھی باقی رہے گا۔ اور جمال بھی جب زبانِ تشکر گنگ ہو جائیگی جبینوں سے سجدوں کا نور چھن جائے گا۔ عبودیت کے اعتراف و اظہار کے سلسلے ختم ہو جائیں گے تو کائنات کے طلسم خانے کو باقی رکھنے کی بھی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

حضوری کی لذتیں

کبریائی خدا تعالیٰ کی ذات کے لیے زیبا ہے بندے کا کام بندگی ہے۔ بندگی کا مقام چھوڑ کر بندہ کبریائی کا منصب اختیار کر لیتا ہے تو شدّاد، نمرود ہامان اور فرعون کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے، بندگی کے مفہوم سے قطعی طور پہ نا آشنا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اپنی تخلیق کے مقصد کو نظر انداز کر دیتا ہے بندے کا کمال یہ نہیں کہ وہ خدائی منصب پہ ہاتھ مارنے کی کوشش کرے، عبودیتِ کاملہ ہی اسے بلندیاں اور سرفرازیاں عطا کر سکتی ہے۔ کافر مہاتما بننے کے لیے ترکِ لذات کرتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غار و کوہ کی زندگی اختیار کر لینے کے بعد بھی بندگی کے مفہوم سے بے خبر رہتا ہے اور مومن کی زندگی کا مقصد چونکہ بندگی کا حصول ہوتا ہے اس لیے تھوڑی سی عبادت بھی اسے بندگی کے مفہوم و معنی سے آشنا کر دیتی ہے۔ عبادت کرتے وقت مومن پہ جو خشوع و خضوع طاری ہوتا ہے، اس کی روح جن مستیوں اور سرشاریوں سے دوچار ہوتی ہے وہ کافر

کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ عبادت میں صحیح لطف اسی وقت آتا ہے جب بندے کو اپنے بندہ اور معبود کے قادر مطلق اور رحیم و کریم ہونے کا صحیح احساس ہو۔ اسی لیے عبودیت کبریٰ کے مفہوم و معنی سے آگاہ انسانِ کامل نے یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرتے وقت یہ احساس بیدار ہونا چاہیئے کہ میں اس کی بارگاہ میں کھڑا اسے دیکھ رہا ہوں یہ سعادت نصیب نہ ہو تو کم از کم یہی خیال ہونا چاہیئے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

کثیف اشیا کی رویت کا تعلق حواسِ ظاہری سے ہوتا ہے کثیف کو دیکھا اور چھوا جا سکتا ہے لیکن لطیف کو محسوس کیا جاتا ہے، اسے نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے خوشبو بھی لطیف ہے اسے بھی ہماری ایک لطیف حس محسوس کرتی ہے۔ جو ذات لطیف ہو اس کی آمد کا احساس ہوتا ہے وہ ہماری گرفت میں نہیں آسکتی۔ ذاتِ واجب الوجود بھی چونکہ لطیف ہے۔ بلکہ لطیف تر اسی لیے اسکی آمد کا سراغ بھی احساسات کی دنیا سے لگایا جا سکتا ہے جب احساسات کی دنیا میں تلاطم بپا ہو، نین برسنا شروع کر دیں کہ آنسوؤں کا نہ منقطع ہونیوالا دل کی دنیا کی حشر سامانیوں کا پتہ دینے لگے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یار آگیا۔ کیونکہ جب مدت کے دو بچھڑے ملتے ہیں تو آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ مومن کی نماز کو اسی لیے معراج المومنین کہا گیا ہے کہ یہ طالب و مطلوب کی ملاقات کا وقت ہوتا ہے۔ حسن و عشق ہم آغوش ہوتے

ہیں۔ دوری مٹ جاتی ہے اور قرب نصیب ہو جاتا ہے۔ کافر کی عبادت میں
نہ لذت ہے نہ سرور، جب ہجر و وصال کا احساس ہی نہ ہو تو کون روتا ہے؟ یا
جدائی کا احساس رلاتا ہے یا قرب کی سرشاریاں، کافر دونوں سے محروم ہے
اسے نہ جدائی کا احساس ہوتا ہے، نہ قرب کی خواہش، مہاتما بننے کی فکر میں بیچارہ
بتوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور انہی حجابات میں دم توڑ دیتا ہے۔

کسی بادشاہ کے دربار میں دشمن کے اسلحہ سے لیس ہو کر کوئی حاضر
ہو، تو شایانِ نوازش قرار نہیں پاتا۔ لطف و کرم کا مستحق وہی قرار پاتا ہے
جو مطیع و منقاد ہو۔ جس کی ہر ادا سے اطاعت و فرماں برداری ظاہر ہوتی
ہو جو لوگ عبادت کرتے وقت غلط آرزوئیں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔
سروں میں غیر کا سودا ہوتا ہے اور دل میں خواہشات کے لات و منات،
وہ عبادت سے لذت گیر نہیں ہو سکتے۔ عبادت ان کی ہے جو غلط آرزوؤں
سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اور اپنے تمام امور خدا تعالیٰ کو سونپ دیتے
ہیں۔ وہی آرزو کرتے ہیں جو رضائے الٰہی کے مطابق ہو، وہی دعا مانگتے
ہیں جو حسنات کی ضامن ہو۔ پیٹ میں اگر حرام کا لقمہ موجود ہو، تو کیا مالک حقیقی خوش
ہوگا یا اس کے غضب میں اضافہ ہو جائے گا؟ قرب کی لذتیں اور سرشاریاں
تو اپنوں کیلئے ہوتی ہیں۔ غیروں کو کون نوازتا ہے اور ان سے کھل کر کون بات کرتا
ہے؟ اعلیٰ سے تعلقات ہوں تو لباس بھی اعلیٰ پہننا پڑتا ہے۔ حضوری کے

بیلیے بھی ظاہری اور باطنی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔

خدائی خدمت گار

سورج چاند ستارے شجر و حجر۔ پہاڑ اور دریا سب خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے مظاہر ہیں یہ سب خدا تعالیٰ کی اطاعت گزاری میں لگے ہوئے ہیں جس کے ذمے جو خدمت ہے، وہ انجام دے رہا ہے۔ ہر ایک کا ایک وظیفۂ حیات مقرر کر دیا گیا ہے۔ سورج کے ذمے ضوباری کی خدمت ہے، وہ ظلمت نہیں پھیلا سکتا۔ چاند کو خنکی عطا کرنے کی خدمت سونپی گئی ہے، وہ یہی وظیفۂ حیات سر انجام دے رہا ہے۔ ستاروں کو خرام بخشا گیا ہے ان کی گردش کم نہیں ہوتی دریاؤں کو روانی عطا کی گئی ہے وہ کبھی نہیں رکتے۔ قدرت کے یہ کارندے اپنے کام میں لگے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آفتاب و ماہتاب کی گردشیں رک گئی ہوں۔ ان کی ضوباریوں میں فرق آگیا ہو، حرارت و برودت عطا کرنے سے انہوں نے انکار کر دیا ہو یا ان کے طلوع و غروب کے نظامِ اوقات میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو۔

قدرت کا یہ کارخانہ ایک نپے تلے نظام کے تحت چل رہا ہے جس میں کوئی تغیر ممکن نہیں خدائی خدمت گار پوری وفاداری سے مفوضہ

امور سرانجام دے رہے ہیں، اور ان سے کسی لغزش کا صدور ممکن نہیں۔

انسان اور تمام موجوداتِ عالم میں یہ بنیادی فرق ہے کہ انسان کے ذمے دوسری مخلوق کی طرح کوئی خاص خدمت نہیں۔ یہ سورج کی طرح ضو باری پر بھی مامور ہے، اور چاند کی طرح ٹھنڈک پہنچانے کا بھی ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اسے بادِ بہاری کا خرام، پھولوں کا تبسم، ستاروں کی دلکشی، کوہساروں کی جبروت مندی اور شبنم کی خنکی عطا کی گئی ہے۔ جلال و جمال کے اس مجموعۂ اضداد کو مختلف اور متنوع خدمات سونپی گئی ہیں جو فرائضِ حیات مختلف عناصرِ قدرت مل کر سرانجام دیتے ہیں۔ انہیں یہ تنہا سرانجام دے سکتا ہے۔ اور اسے وہ تمام صلاحیتیں دے دی گئی ہیں جو اس کے لیے ضروری تھیں، کیونکہ یہ دنیا میں نائبِ حق اور زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ نیابت کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے جلال و جمال دونوں کی ضرورت ہے۔ جلال نہ ہو تو یہ قہاری کا مظہر نہیں بن سکتا، جمال نہ ہو تو یہ غفاری کی شان نہیں دکھا سکتا۔

یوں بھی بادشاہوں کے دربار میں دو طرح کی مخلوق ہوتی ہے ایک کو نوکر کہا جاتا ہے اور ایک کو غلام۔ نوکروں کے ذمے خاص خاص کام ہوتے ہیں اور غلام کسی خاص خدمت پر مامور نہیں ہوتا۔ شاہ جو چاہتا ہے اس سے کام لیتا ہے، اس کی خدمت کے اوقات بھی مقرر

نہیں ہوتے۔ دربار میں ہمہ وقت اس کی حاضری ضروری ہوتی ہے۔ شاہ کا اشارہ ابرو پلتے ہی وہ کسی تامل کے بغیر خدمت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ نوکر وہی خدمت سرانجام دیتا ہے جو اس کے ذمے ہو۔ نوکروں کو تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن غلام چونکہ زرخرید ہوتا ہے، اس لیے تنخواہ نہیں پاتا۔

مومن کی حیثیت رب تعالیٰ کے غلام کی ہے۔ سورج چاند ستارے اور اسی نوع کی دوسری تمام مخلوق نوکروں کی حیثیت رکھتی ہے، وہ خاص خاص فریضے سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن مومن کو حضوری میں رہ کر وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جس کا رب تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو۔ کیونکہ مومن کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا گیا ہے۔ سودا ہو چکا ہے۔ قیمت ادا کر دی گئی ہے۔ اب اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ رب تعالیٰ کا حکم سن کر یہ کہے کہ یہ کام کروں گا اور یہ نہیں کروں گا۔ یہ میری مرضی کے مطابق ہے اور یہ میری مرضی کے مطابق نہیں۔ اب مرضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غلام کو آقا کے سامنے چون و چرا کی مجال نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ غلام خریدا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیا جائے۔ اس کے لیے ہمہ وقت کی حاضری ضروری ہوتی ہے۔ نوکروں کے لیے مخصوص کام ہوتے ہیں۔ اور ان کے لیے حاضری بھی ضروری نہیں ہوتی۔ عالمِ موجودات کی ہر چیز نوکر ہے اور مومن غلام۔

رحمت کی پردہ پوشی

قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

"کیا بندے کے لیے اللہ کافی نہیں؟"

اس سوال کا جواب بندے کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا گیا ہے بندہ جب خدا تعالیٰ کو اپنے لیے کافی سمجھ لیتا ہے، تو خدا اس کی ضرورتوں کا کفیل بن جاتا ہے۔ جب خدا کی ذات سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے اور انسان عقل کی رہنمائی میں زندگی کی راہیں طے کرنے کا عزم لے کر اٹھتا ہے تو قدم قدم پر اسے ہزیمتوں اور ذلتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بامراد ہو کر بھی ناکام رہتا ہے۔ ایک باغی انسان کی وہ تمام کامیابیاں اور کامرانیاں جرم کی حیثیت رکھتی ہیں جو وہ اپنی حکومت کے آئین و قوانین سے انحراف کے بعد لوٹ کا مال فراہم کرنے سے حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی اپنی نگاہ میں خواہ یہ کامیابیاں کتنی بھی وقیع اور جاندار کیوں نہ ہوں، حکومت کی نگاہ میں وہ مجرم اور خطا کار ہو گا۔ کامیابی وہی کامیابی ہو سکتی ہے جو حکومت کے آئین و قوانین کے تحت رہ کر حاصل کی جائے۔ باغی اور خاطی انسان کی کامیابی حکومت سے خراجِ

تحسین وصول نہیں کر سکتی ۔ حکومت کی رضا کے تابع رہ کر کسی محاذ جنگ پر زخمی ہونے والا سپاہی داد و دہش کا مستحق قرار پاتا ہے اس کی موت بھی واقع ہو جائے تو وہ کامیاب کہلاتا ہے ۔ حکومت کی طرف سے اسے خوشنودی کی سند عطا ہوتی ہے اور رضا کا پروانہ ملتا ہے ۔ بندہ بھی جب خدا کی راہ میں ہزیمتوں اور پریشانیوں کو برداشت کرتا ہے تو اسے خوشنودی کی سند عطا ہوتی ہے ۔ شیطان کی راہ پر چلنے کے بعد جو کامیابی حاصل ہو وہ عارضی اور وقتی ہوتی ہے ۔ اسے ثبات و دوام حاصل نہیں ہوتا ۔ ایسی کامیابی میں نہ انسان کا ضمیر مطمئن رہ سکتا ہے اور نہ ہی اسے تسکین کی وہ دولت نصیب ہو سکتی ہے جو رضا کے بندوں کا حصہ ہوتی ہے تسکین رضا میں ہے تسلیم میں ہے اس راہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو یہ کبھی حاصل ہوئی ہے، نہ ہو گی ۔ باغی انسانوں کی کامیابیاں ان کی شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہیں محاسبے کا ہاتھ جب بھی آستین سے نکلتا ہے، پندار کے تمام صنم کدے ویران کر کے رکھ دیتا ہے ۔ ماخوذ مجرم کے تمام عذر عدالت کے روبرو پیش ہونے کے بعد باطل ہو جاتے ہیں ۔ اس کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوتا ۔ یہ صرف خدائے رحیم و کریم ہی کی عدالت ہے کہ انسان کسی مرحلے پر بھی گناہ کا اعتراف کرلے اور عجز کا سرمایہ لے کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہو جائے تو اس کی بخشش و رحمت کا حق دار بنتا ہے ۔ تمام عمر معصیت کی زندگی بسر

کرنے کے بعد اس کی رحمت کو پکارتا ہے تو مایوس نہیں لوٹتا، دنیا کی عدالتیں کسی انسان کو بار بار قانون شکنی کرنے کے بعد عادی مجرم قرار دے دیتی ہیں اور اس کے ساتھ کوئی رعایت برتنا گوارا نہیں کرتیں لیکن خدا تعالیٰ بار بار توبہ توڑنے والوں کو اپنی بارگاہ سے نہیں دھتکارتا، ہر بار ان کے لیے بخشش و رحمت کے دروازے کھلتے ہیں، عادی مجرم قرار دے کر رحمت کا دروازہ بند نہیں کر دیا جاتا۔

دنیا کے قانون اور خدا کے قانون کی فطرت جداگانہ ہے۔ ایک کو پکڑنے میں مزا آتا ہے، سزا دینے میں لذت محسوس ہوتی ہے اور ایک چھوڑ دینے کا عادی ہے معاف کر دینا اس کی عادت ہے۔ پکڑنے کے لیے حیلے بہانے تلاش کرتا ہے اور ایک چھوڑ دینے کے حیلوں بہانوں کی تلاش میں رہتا ہے تلاش دونوں کی مختلف ہے، مزاج دونوں کا جدا ہے عادت دونوں کی الگ ہے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں، کوئی علاقہ نہیں۔ ماخوذ ہونے اور گرفت میں آنے کا شوق ہو تو انسان کے بنائے ہو قوانین کے تحت آنا چاہیئے۔ ان کی متابعت کرنی چاہیئے رہائی اور نجات مطلوب ہو تو ربانی قوانین کی اطاعت قبول کرنی چاہیئے چھوٹے ظرف والا اپنے ظرف کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ ظرف اگر غیر محدود ہو تو رحمت بھی غیر محدود ہو گی۔ خدا تعالیٰ کے عفو و کرم کا

سمندر چونکہ غیر محدود ہے اس کے کنارے ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے ہیں
اسی لیے اس کی رحمت کی بھی کوئی انتہا نہیں، وہ بخشنے پہ آتا ہے تو ان مجرموں
کو بخش دیتا ہے جن کی بخشش کی کوئی صورت نہیں ہوتی، نوازنے پہ آتا ہے
تو گداؤں کو شاہ بنا دیتا ہے۔ ایسے کریم کے دروازے سے صرف وہی لوگ
محروم لوٹ سکتے ہیں جن کی نظر اس کے الطاف پر نہیں ہوتی اور جو گدائی
کے سلیقے سے محروم ہوتے ہیں گدا کی آواز کا سوز، سخی کے رحم و کرم کو متحرک
کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور بندے کی آواز میں جب سوز پیدا ہو جاتا ہے
اور اس کی صدا دردناک بن جاتی ہے۔ تو رحمت بڑھ کر اسے آغوش میں
لے لیتی ہے اور اس کے لیے پردہ پوش بن جاتی ہے۔ پردہ پوشی خدا کی رحمت
کا خاصہ ہے بشرطیکہ بندہ خود کو اس کا اہل ثابت کرنے کی صلاحیتوں سے محروم نہ ہو

اِنسانی شرف

انسان کو خدا نے تکریم کا لباس پہنانے کے بعد جن نعمتوں سے نوازا ہے
وہ اس کی عظمت و قدرت اور حکمت بالغہ کی بیّن نشانیاں ہیں ذہن انسانی
کو جو رفعتیں نصیب ہوئی ہیں، زبان کو نطق و بیان کی جو قوتیں ملی ہیں، بصارت
کو جو تیزی عطا ہوئی ہے، سماعت کو جو لطافتیں بخشی گئی ہیں، اور ذوق و وجدان

کو جو نزاکتِ احساس ودیعت ہوئی ہے۔ یہ سب آیاتِ الٰہیہ ہیں، ربانی عطیات ہیں، یہ نعمتیں خدا تعالیٰ کی امانت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان کو ان کا امین بنایا گیا ہے خزانچی مالک کی مرضی کے خلاف امانت میں تصرف کرے تو امین نہیں، خائن سمجھا جاتا ہے۔ امین خازن وہی ہوتا ہے جو مالک کی مِلک میں تصرف کرتے وقت اس کی مشیّت اور ارادے کو ملحوظ رکھے، جہاں جہاں اسے تصرف کا حق دیا گیا ہو وہیں تصرف کرے اور جن جن خطرات سے مال کو محفوظ رکھنے کی تلقین کی گئی ہو، ان سے مال کو بچانے میں امکانی کوشش صرف کرے۔

جو خازن اپنے مالک کے دشمنوں کے لیے خزانے کے دروازے کھول دے اور انہیں لوٹ گھسوٹ کی عام اجازت دیدے، ان سے مزاحم ہونے کی بجائے ان کا معاون و مددگار بن جائے، وہ آقا کے انعام و اکرام کا مستحق نہیں ہوتا۔ وشمن کے ہراول دستے کا امام سمجھا جاتا ہے اور مالک کے غیظ و غضب کا مورد بنتا ہے۔ شایانِ کرم وہی خازن قرار پاتا ہے، جو جان دے کر بھی امانت کی حفاظت کرے۔ جو لوگ ذہانت کو اقدارِ عالیہ اور اخلاقِ فاضلہ کے خلاف صرف کرتے ہیں، جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز ثابت کرنے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو صرف کرتے ہیں، وہ امین نہیں، خائن ہوتے ہیں۔

ذہانت خیر کو پھیلانے اور شر کی روک تھام کے لیے عطا کی گئی ہے

نگاہ حق و باطل میں امتیاز کرنے کا آلہ ہے زبان کا وظیفہ یادِ دوست ہونا چاہیئے۔ یہی زبان اگر شیطانی قوتوں کی قصیدہ خوانی کرنے لگے، نظر حق کا حسن و جمال دیکھنے کی بجائے باطل کی مٹ جانے والی چمک دمک پر مرکوز ہو جائے اور سماعت ذکرِ دوست سے لذت گیر ہونے کی بجائے لغو داستانوں اور کہانیوں میں کھو کر رہ جائے تو یہ نعمت کا صحیح استعمال نہ ہوگا۔ انسان کو ظاہری اور باطنی جو نعمتیں بھی دی گئی ہیں وہ مثبت کے تابع رہ کر استعمال کی جائیں تو انسان کو اشرفیت کے مقام پر فائز کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ورنہ انسان ارذل ترین مخلوق قرار پاتا ہے۔ درندے اور چوپائے کسی مساوی قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کی دنیا میں صرف جنگل کے قانون کی فرمانروائی ہوتی ہے۔ عقل و شعور اور فہم و ادراک کی دولت نہ ہی انہیں تفویض ہوئی ہے، اور نہ ہی وہ اس سے کام لے سکتے ہیں۔ یہ صرف اشرف المخلوقات کا حصہ ہے۔ انسان بھی اس دولت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اس سے کام نہ لے تو جانوروں سے ارذل ترین ہو جاتا ہے، کیونکہ انہیں یہ دولت نہیں ملی اور یہ اس کا مالک ہونے کے باوصف اسے غلط استعمال کرنے کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ارتکاب گناہ کی سزا مجرم کو اس کے مقام اور مرتبے کے سے ملتی ہے حکومت کی طرف سے کسی انسان کو اعلیٰ اختیارات دیئے گئے ہوں، اسے سرکاری خزانے کا محافظ بنایا گیا ہو تو اس کے سرقہ کی سزا عام انسانوں کی سزا سے

مختلف ہوگی، رّبانی قوانین کا مزاج بھی یہی ہے یہاں بھی مقام اور مرتبے کے اعتبار سے گرفت ہوتی ہے مقرّبینِ بارگاہ کو معمولی لغزش پر بھی تنبیہہ ہوتی ہے اور عام انسانوں کی ایسی فرو گذاشتیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھی جاتیں۔ برہمنی فلسفہ ہی پروہتوں اور پنڈتوں کو تعزیرات سے مستثنےٰ قرار دے سکتا ہے، اسلام کا یہ مزاج نہیں۔ یہاں نسلی تفوّق وجہِ امتیاز نہیں، انسانی شرف کا معیار تقویٰ ہے۔

دل کی رفتار

ایک غلام کے لیے شاہ کی بارگاہ کی حاضری سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے۔ لیکن حضوری کی وہی نعمت، نعمت بن سکتی ہے جو شاہ کی ذات سے نسبت قائم ہونے کے بعد حاصل ہو۔ نسبت قائم نہ ہو، اور انسان صاحبِ حضور بن جائے تو یہ المیہ بڑا اندوہناک ہوتا ہے حضوری ہی ہلاکتوں کا سامان بن جاتی ہے۔ حضوری وہی رحمت ہوتی ہے جس کے ذریعہ رضا کے پھول چنے جائیں، درگاہ سے وابستہ ہونے کے بعد اگر انسان کی توجہ رضا کے پھول چننے کی بجائے پست آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل پر مرکوز ہو جائے تو یہ وابستگی عذابِ الٰہی سے کم نہیں

ہوتی، خواہشات کے غلبے کے باعث انسان آنکھیں ہونے کے باوجود اندھا ہو جاتا ہے اور شاہ کے جمال کی لذت سے محروم رہتا ہے۔ جمال کی لذت بھی انسان کے کیف وکم کا باعث بنتی ہے۔ جس کی نظریں جمال پہ ہوں۔ حضرت علیؓ کو نماز میں جو لذت نصیب تھی یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ حالتِ نماز میں ان کے بدن سے تیر کھینچ لیا جاتا تھا، اور انہیں خبر نہ ہوتی تھی یہ بے خبری کس نے عطا کی؟ مشاہدۂ جمال کی لذت نے حضوری کے کیف وسرور اور نسبت کے اس غلبے نے جو بندے کو اپنے مولا سے حاصل تھی حضوری وہی کیف د سرور بخش سکتی ہے جو نسبت اور تعلق کے فیضان سے خالی نہ ہو۔ ہر صاحبِ حضور، صاحبِ سرور نہیں ہوتا۔ بعض قریب رہ کر بھی دور رہتے ہیں بعض دور ہونے کے باوصف قریب ہوتے ہیں۔ اویس قرنیؓ دور ہونے کے باوجود قریب تھے اور ابوجہل قریب ہونے کے باوجود دور تھا،

دراصل بے خبر لوگوں کو صاحبِ حضور کہنا ہی غلط ہے، دنیا والے قرُب و بُعد کا اندازہ فاصلے کی نسبت سے لگاتے ہیں، فاصلہ طویل ہو تو اسے بُعد سے تعبیر کرتے ہیں، اور فاصلہ مٹ جائے تو اسے قرُب کا نام دیتے ہیں۔ لیکن محبت کی بارگاہ میں قرب و بُعد کا اندازہ جسم کے قرب و بُعد سے نہیں لگایا جاتا یہاں دل کی رفتارِ کار کام دیتی ہے، رُوح کی پرواز کے ذریعہ حریمِ جمال تک رسائی حاصل کی جاتی ہے، جس کی یاد کے دل میں دیپ

جلنے لگیں، جو آنسوؤں میں فروزاں ہو، دل کی دھڑکن سے آشکار ہو وہ دور نہیں ہوتا۔ ہنسانے اور رلانے والا کبھی دور نہیں ہو سکتا، وہ تو احساسات میں مقیم ہوتا ہے۔ ساز کے تاروں کو مغنّی کا ہاتھ نہ چھیڑے تو ان سے نغمے نہیں نکل سکتے، نغموں کا زیروبم مغنی کی چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ ہوتا ہے، مغنّی کا ارادہ کارفرما ہو تو ساز بجتے ہیں، تار ہلتے ہیں، اور ان سے نغمے پھوٹ کر روح کو بالیدگی بخشتے ہیں۔ سات پردوں میں چھپے ہوئے حسنِ مطلق کی تجلیاں روح پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ احساسات کی دنیا کو زیروزبر کرتی ہیں تو انسان صاحبِ حضور بنتا ہے اور صاحبِ حضور بن جائے تو صاحبِ سرور بھی کہلاتا ہے کیونکہ سرور حضوری کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآن میں بعض نمازیوں کی نماز پر اظہارِ تاسف کیا گیا ہے، حالانکہ نماز حضوری ہے لیکن جو حضوری کسی کیفیت اور لذت کے بغیر ہو وہ حجاب ہے، پردہ ہے، پردہ اٹھنے کا نام حضوری ہے۔ جمال کی لذت سے بہرہ ور ہونے والے کو صاحبِ سرور کہا جاتا ہے۔ غافل انسان نہ صاحبِ حضور ہو سکتا ہے، نہ صاحبِ سرور، وہ تو قریب رہ کر بھی دور ہوتا ہے، صاحبِ حضور ہونے کے باوجود نہ اس کے ہجر کے دن ختم ہوتے ہیں، اور نہ اس کی جدائی کی راتوں کو جلوہ تابِ سحر نصیب ہوتی ہے، اس کے مقدر میں ظلمتیں ہی ظلمتیں ہوتی ہیں، اور مہجوری کسی حال میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

منزلِ لیلیٰ

طلب اگر صادق ہو تو انسان کو واصلِ منزل بنا کر چھوڑتی ہے خام طلب کے باعث منزل کا قرب بھی طویل مسافت نظر آنے لگتا ہے۔ اور صدیق طلب طویل مسافت کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ قرب و بعُد دراصل اضافی امور ہیں، طلب کے صدق و کذب ہی سے ان کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ قصرِ شیریں عقلی نقطۂ نگاہ کے مطابق دور ہو سکتا ہے۔ عقل کو وہاں تک رسائی مشکل نظر آتی ہے لیکن فرہاد کے نزدیک وہ دور نہیں، وہ تیشے کے ذریعے یہ راہ عبور کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وادیٔ نجد اور منزلِ لیلیٰ میں لاکھ بعُد سہی لیکن قیسِ عامری کا ولولۂ شوق اس بعُد کو تسلیم نہیں کرتا، وہ اسے دو قدم ہی سمجھتا ہے۔ کسی مسافر کے پاس ولولۂ شوق کی متاع موجود ہو، اس کے سینے سے جذبات کے طوفان اٹھ رہے ہوں تو اسے محروم نہیں کہا جا سکتا۔ محرومی اس مسافر کا حصہ ہوتی ہے جو منزل کے شوق سے محروم ہو، اس کے دل میں کوئی اُمنگ پیدا نہ ہو سکے اور پیش آنے والے خطرات کا تصوّر اس کے پاؤں کی زنجیر بن جائے۔ اسے آگے بڑھنے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے سے روک کے شوق کی فراوانی دم توڑتے ہوئے

مسافروں کے دل پر یاس کا غلبہ طاری نہیں ہونے دیتی وہ اسی محرومی کو کامیابی سمجھتا ہے، اور ذوق و شوق اور سوز و درد سے محروم انسان کو اگر کوئی حادثہ منزل سے ہم کنار کبھی کر دے تو وہ عشق کی دنیا کی ان لذتوں سے شناسا نہیں ہو سکتا جو آبلہ پا مسافر کو وادیٔ شوق میں نصیب ہوتی ہیں۔ اہل دل کے لیے محبت کی راہ کے کانٹے پھولوں سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ اور بوالہوس کے لیے پھولوں میں بھی کوئی ندرت نہیں ہوتی، وہ ان کی لطافتوں سے بھی صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا، لطف اندوزی احساس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ احساس اگر لطیف ہو تو وہ راہِ دوست میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو بھی محبت کے پھول سمجھ کر دامن میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ احساس ہی اگر سرے سے مفقود ہو تو پھول بھی بُو باس نہیں دیتے محبت کی فراوانی کی بدولت یوسفؑ کی قمیص پیرِ نابینا کو کنعان میں بھی مست و سرشار کر سکتی ہے۔ اور برادرانِ یوسف اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

محبت چمنستانِ قدس کے پھولوں سے نکلی ہوئی خوشبو کا نام ہے، یہ بُو حواسِ ظاہری سے نہیں سونگھی جا سکتی، اسے محسوس کرنے کے لیے ایک اور حس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس حس کا نام بھی محبت ہے۔

مادی چیزوں کو ظاہری حواس کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن لطیف اشیاء کا لطیف احساسات ہی ادراک کر سکتے ہیں۔ ایمان تمام تر

محبّت ہے اور محبّت لطافت، اسے عقل کی میزان پہ رکھ کر تولنے کی کوشش بے سُود ہو گی۔ یہ سود و زیاں کا سودا نہیں یہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے اور اس کے اثرات سے ذوق و وجدان لذت گیر ہو سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے مفاد حاصل کرنے کے لیے اور نقصانات سے بچنے کے لیے خدا تعالیٰ سے تعلق قائم کیا ہو۔ ان پر محبت کے معانی و مطالب کیسے آشکار ہو سکتے ہیں، محبت تو ایک آگ ہے جو اغراض کے تمام خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے عقل کا پانی اس آگ کو نہیں بجھا سکتا، بلکہ اس پانی سے اس کے شعلوں کی تیزی اور فزوں ہوتی ہے اور بڑھتی ہے۔

دنیا کی آگ پانی سے بجھائی جا سکتی ہے لیکن محبت کی آگ آبِ شمشیر سے بھی نہیں بجھتی۔ آبِ شمشیر سے اس کے شعلوں کے رقص میں اور اضافہ ہو جاتا ہے عقل محبت کے شعلوں کے رقص کے زاویوں کو سمجھنے سے اس لیے قاصر ہے کہ وہ کبھی جلی نہیں، اسے آگ نہیں لگی۔ اور محبت سراپا آگ ہے۔ پروانے کی فطرت سمجھنے کے لیے سوز آشنا دل درکار ہوتا ہے، سوز سے خالی دل نہ اس کے تڑپنے اور لوٹنے کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان پر اس کے تپش و گداز کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔

روح کی تابانیاں

انسان جس بارگاہ سے وابستہ ہوگا، اسی کی نسبت سے اُسے عظمتیں ملیں گی۔ پٹواری کے بستہ بردار کو وہ عظمتیں نہیں مل سکتیں جو تحصیل دار کی بارگاہ میں رہنے والے ملازم کو حاصل ہوتی ہیں۔ عالی بارگاہ کا ادنیٰ ملازم بھی عزت و عظمت کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور ادنیٰ بارگاہ کی سرفرازی بھی عظمتیں عطا نہیں کرتی۔ بلکہ ایک شاہ کے دسترخوان کی ریزہ چینی کرنے والا شاہ کے دروازے سے اٹھ کر کسی معمولی درجے کے انسان کی بارگاہ میں عزت و عظمت حاصل کر بھی لے تو وہ ملامتوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔ دنیا اسے تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور اس کی کم عقلی کا ماتم کرتی ہے کہ وہ کہاں سے اٹھ کر کہاں آگیا۔ جو عزت اسے نصیب ہوتی ہے وہی اس کی ذلتوں کا موجب بن جاتی ہے۔ اعلیٰ ذات کی بارگاہ کی محرومی شہدوں اور کمینوں کی بارگاہوں کی عطا و بخشش پر فوقیت رکھتی ہے شہدے اور کمینے کچھ عطا بھی کر دیں تو اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، ہر ہر گھڑی کے وقت طعنہ دیتے ہیں، کہ اتنا پانے کے بعد بھی تجھ میں تشکر کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ کمینوں کی ساری عظمتیں محتاجوں کو ذلیل و رسوا کرنے

اور ان کی احتیاج کا اشتہار دینے سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اعلیٰ بارگاہ میں رہ کر انسان کو ان ذلتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وہاں سے کچھ عطا ہو تو اس کا اشتہار نہیں دیا جاتا قصور ہو جائے تو معاف کر دیا جاتا ہے عطا و بخشش کے طعنوں سے غیرت و حمیّت کے آبگینوں کو پاش پاش نہیں کیا جاتا کمینے کی درگاہ کی وابستگی خودی کی موت ہوتی ہے۔ یہاں رہ کر غیرت و حمیت سے محروم ہونا پڑتا ہے، ایک عظمت مل بھی جائے تو ان کئی عظمتوں سے محروم ہونا پڑتا ہے جو انسان کو قدرت کے عطیے کے طور پر ملی ہوتی ہیں۔ کمینہ اپنی دی ہوئی عزت و عظمت کو چھیننے کے حیلے بہانوں کی فکر میں رہتا ہے۔ اور اعلیٰ ذات عظمتیں دے کر چھینتی نہیں۔ بلکہ ان کے تحفظ و بقا کی فکر میں رہتی ہے کریم ذات کی عطا کردہ عظمتوں کو انسان اگر اپنی عدم صلاحیت کے باعث ضائع کر دے تو اسے قلق ہوتا ہے کہ اس نے نعمت کی قدر نہ کی، وہ اسے سرزنش کا مستحق سمجھنے کی بجائے رحم و کرم کا مستحق سمجھنے لگتی ہے اور اس کی مزید عنایات اس کے شامل حال ہو جاتی ہیں۔

گناہ گار کی توبہ اسی لیے قبول ہے کہ وہ سعادتوں سے محروم ہوتا ہے اس کی محرومی کے جذبات دل یزداں میں رحم و کرم پیدا کر دیتے ہیں جنہیں اسے آغوش میں لینے کے لیے مضطربانہ بڑھتی ہیں گناہ گار کی توبہ اسی لیے شایان کرم قرار پاتی ہے کہ اس میں عطا کی مظہر بننے کی صلاحیت موجود ہوتی

ہے۔ دل کی شکستگی خدا کو اسی لیے عزیز ہے کہ یہاں حسنِ فطرت کے جلووں کو سمیٹنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ آئینہ جلا پانے کے بعد حسن کی نظروں کا مرکز بن جاتا ہے، اور دل شکستہ ہونے کے بعد تجلیاتِ ربانی کا گہوارہ بنتا ہے۔ مقامِ تجلی لطافت ہے، کثافت پر تجلی عکس ریز ہو بھی جائے تو اس کا حسن ظاہر نہیں ہوتا۔ کثیف ہمن کے جلووں کو سمیٹنے اور انہیں آشکار کرنے کی صلاحیتوں سے فطرتاً محروم ہوتا ہے۔ ابوجہل پہ انوارِ نبوت اس لیے اثر انداز نہ ہو سکے کہ اس کی روح کی کثافت انوارِ نبوت سے فیض یاب ہونے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ ان لطیف جلووں کو تو وہی روحیں سمیٹ سکتی تھیں، جو ازل سے پاک اور منزہ تھیں، فطرت میں پاکیزگی موجود ہو تو ہنگامی اور وقتی کثافتوں کے بادل بھی چھٹ جاتے ہیں، حسین جسم نہانے کے بعد اجلا ہو جاتا ہے اور حسین روح جس پہ گناہوں کی کثافتیں چھائی ہوں، ندامت کے آنسوؤں سے غسل کر لیتی ہے، تو اس کی تابندگی اور تابانی ظاہر ہونے لگتی ہے۔ کھل کر بادل برستے ہیں تو فضا کا حسن زیادہ حسین اور دل آویز نظر آنے لگتا ہے۔ نیناں کی رم جھم جو روح کی گہرائیوں سے احساسات کے اٹھنے والے بادلوں کے خرام کا نتیجہ ہوتی ہے، روح کو شگفتگی اور شادابی عطا کرتی ہے۔ رم جھم کوئی بھی خالی نہیں جاتی۔ خواہ وہ برسنے والے بادلوں کے خرام کا نتیجہ ہو، یا ندامت سے جھکی ہوئی پلکوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کا ثمر۔

دونوں نتیجہ خیز ہیں اور دونوں میٹھے آفریں ایک کی معنویت ویرانوں کو گل و گلزار بناتی ہے۔ اور ایک کی جاذبیت رحمتوں کو دراز ہونے اور ان کا سلسلہ وسیع تر کر دینے کا موجب بنتی ہے ایکسد کا فیضان گل و گلزار ہوتے ہیں اور ایک کا عطیہ روح کی تابانیاں

تجلّی کا پیام

خدا تعالیٰ کی رضا کا معاملہ تو خیر بہت دور کی بات ہے، قربانی دیئے بغیر بندے کی رضا بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایک دوست کی رضا حاصل کرنے کے لیے بسا اوقات سخت سے سخت ترین مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور کبھی آبرو کو لاحق ہونے والے خطرات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

محبت چیز ہی ایسی ہے کہ قربانی چاہتی ہے یہ پودا ہی ایسا ہے، جس کی آبیاری کے لیے آرزوؤں اور تمناؤں کا خون درکار ہوتا ہے۔ اس پر بہار ہی نہیں آتی، جب تک اس کی خون سے آبیاری نہ کی جائے۔

پھر جس قسم کی محبت ہو گی اسی نوعیت کی قربانی کا مطالبہ کرے گی۔ محبت کے کچھ مقامات ایسے ہیں جنہیں ہنستے کھیلتے طے کیا جا سکتا ہے۔

بعض جگہ مال کی قربانی کی ضرورت پیش آتی ہے اور بعض جگہ جان قربان کرنے کے بعد بھی ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی۔ جی یہی چاہتا ہے کہ ہزار جان ہوتی قربان کر دیتا۔

یک جاں چہ کند سعدی مسکیں کہ دو صد جاں
سازیم فدائے سگِ دربان محمدؐ

انسان میں مسکینی بھی محبت ہی پیدا کر سکتی ہے عقل سرفرازوں کی گردن کو اور اونچا کر سکتی ہے لیکن جھکا نہیں سکتی یہ محبت ہی کا شیوہ ہے کہ وہ ساری سرفرازیاں محبوب کی بارگاہ میں قربان کر دینے کو اپنے لیے موجبِ فخر سمجھتی ہے۔

عشق از یں بسیار کرد ست و کند

عقل کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ لوٹنا چاہتی ہے اور لٹنا صرف محبت کا شیوہ ہے اور اسے لوٹ کر نہیں لٹ کر مزا آتا ہے۔ پروانے نے ادائے جاں نثاری کسی مکتب میں رہ کر نہیں سیکھی، سوز اس کی فطرت میں موجود تھا، شمع کو دیکھا تو جل گیا۔ صدیق رضؓ نے شمعِ رسالت کو دیکھا تو ادائے جاں نثاری سے صدیقؓ کے رتبے کو پہنچ گئے۔ محبتِ چونکہ خود صدیق ہے اس لیے صدیق بنا دیتی ہے عقل خود غرض ہے اسلئے زندیق بنا کر چھوڑتی ہے۔ صدیق بننے کے لیے محبت کے کوچے میں آنا پڑتا ہے، اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرنی پڑتی ہیں جو محبوب کو مرغوب ہوں، ورنہ زندیق بنتا گیا

مشکل ہے؛ ادھر نفس کی بندگی اختیار کی اور ادھر زندیق کا مقام مل گیا۔

ہوس کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں ہے
وہ ہمیشہ مفاد کی طرف رہنمائی کرتی ہے

محبت مفاد پرست نہیں، وہ مفاد قربان کرنا جانتی ہے عقل نے ہمیشہ اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اور محبت کے پیشِ نظر محبوب کی رضا رہی ہے۔ محبت رضائے دوست کے لیئے قربانی دے کر جھومتی ہے۔ خوش ہوتی ہے۔ ایثار کے بعد اسے یہ احساس رہتا ہے کہ مال و جان کی صورت میں حسن کی بارگاہ میں جو پیش کش کی گئی ہے وہ حسن کے قابل نہ تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ محبوب اسے حقیر جان کر ٹھکرا دے۔ لیکن عقل کی یہ عادت نہیں وہ ہر میدان میں ترازو لے کر بیٹھتی ہے، چاہتی ہے کہ اسی کا پلڑا بھاری رہے اور محبت جان دے کر بھی سودا کرتی ہے تو سمجھتی ہے کہ سستا ہے۔ ازل سے اس کا نعرہ یہ ہے۔

اگر قیمت بہ جاں بودے چہ بودے

عقل اپنے لیے سہولتیں تلاش کرتی ہے اس لیئے کہ وہ سہل انگار ہے عشق جفا پیشہ ہے وہ سہولتیں تلاش نہیں کرتا، مشکلات کو آسان بنا دیتا

ہے کوہ کنی اور تیشہ زنی اس کی فطرت ہے۔ اسے نہ مزدور بننے میں عار محسوس ہوتی ہے نہ مزدور کہلانے میں، کبھی تیشہ بدست نظر آتا ہے اور کبھی علم بر دوش۔

دونوں صورتوں میں اس کا مقصود اپنی برتری کا اعلان نہیں ہوتا تیشہ کے ذریعے بھی وہ وصالِ محبوب کی آرزو کرتا ہے اور علم بھی اس کے نزدیک محبوب کی برتری کا نشان ہے اپنا نام ونشان مٹاکر محبوب کی عظمتوں کا جاگر کرنا عشق ومحبت کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے اور عقل ہر جگہ اپنی ہی برتری چاہتی ہے رزم ہو یا بزم، دونوں جگہ وہ اپنا ہی بھلا چاہتی ہے

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ زاہد ہے نہ مُلّا نہ حکیم

محبت اپنی فطرت کی پاکیزگی کی وجہ سے واصلِ منزل ہے اور عقل کے مقدر میں ریب وشک کے اندھیرے ہیں یہ کامیاب ہوکر بھی ناکام رہتی ہے۔ اور وہ ناکامیوں میں بھی وہ مزے لوٹتی ہے جو کامیابیوں سے ہمکنار ہونے والوں کو نصیب نہیں ہو سکتے۔ نصیب اپنا اپنا ہے۔ ایک کے مقدر میں ظلمتیں ہیں اور ایک سراپا نور اور تجلی کا پیام۔

نائب حق

دنیا کا یہ نظام جس ذات کی مشیّت کے تحت چل رہا ہے وہ کامل و اکمل ذات ہے۔ وہی اپنی مصلحتوں کو بہتر سمجھتی ہے۔ پہاڑوں کو ایستادگی اسی نے بخشی ہے، دریا اسی کے حکم سے جاری ہیں۔ ستاروں کی مشعلیں اسی نے روشن کی ہیں، پھولوں کا رنگ اور بو اسی کا عطیہ ہے اور آفتاب و ماہتاب کی گردشیں اسی کا فیضانِ جمال ہیں۔

کوئی شخص قدرت کے نظام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہے تو یہ ناممکن ہے، اپنے وقت پہ آفتاب کا طلوع و غروب کسی کو پسند آئے یا نہ آئے اس میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی آفتاب اپنے وقت پہ طلوع ہو گا اور وقت پہ ڈوبے گا۔ دریاؤں کی روانی بھی کسی کی خواہش کے مطابق نہیں رک سکتی۔ جو خدمت جس کے ذمہ ہے وہ مالکِ حقیقی کا فرماں بردار ہونے کی حیثیت سے سرانجام دے رہا ہے۔ قدرت کے نظام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کے حسن میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا، کبیدہ خاطری سے دیکھا جائے تو پھر بھی یہ جوں کا توں چلتا رہے گا۔

معمولی درجہ کے بادشاہ بھی کسی گھسیارے کے مزاج کی رعایت کر کے اپنے آئین و ضوابط میں ترمیم کرنا گوارا نہیں کرتے تو اس ذات سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ معمولی درجے کے انسانوں کے مزاج کی رعایت کر کے اپنے فیصلے بدل دے گی؟

کسی ذی اختیار کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ماتحت اس کے فیصلوں کا احترام کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ محتاج اور نادار لوگ جن کی زندگی کا تمام تر انحصار کسی سخی کے رحم و کرم پر ہو ان کے متعلق جب سخی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے فیصلوں کو قابلِ ترمیم سمجھتے ہیں تو اس کا غیظ و غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ سخی کے کرم کو یہ متحرک کرنے کا طریقہ نہیں، یہ اس کی عنایتوں سے محرومی کے انداز ہیں۔

غلام، آقا کے فیصلوں میں ترمیم بھی کرا سکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب بندہ خواجہ کے مزاج میں ڈھل جائے۔ اس کی نگاہوں میں محبوبیت کا درجہ حاصل کر لے ہر غلام ایاز نہیں بن سکتا اور نہ ہی محمود ہر زلف کے پیچ و خم میں اسیر ہو سکتا ہے۔ جتنی بڑی ذات کے اعتماد کو جیتنا مقصود ہو اتنی ہی بڑی ادائیں پیدا کرنی پڑتی ہیں۔

آگ اسی وقت گلزار بنے گی جب خلیلؑ کا منصب حاصل
ہو گا اور چھری گلے پہ اسی وقت رکے گی جب اسمٰعیلؑ کی

اطاعت نصیب ہو گی۔ تسلیم و رضا کا پیکر بن جانے کے بعد بندے کو یہ منصب بھی نصیب ہو سکتا ہے کہ حسن مطلق بر افگندہ نقاب ہو کر اس سے یہ پوچھنے لگے کہ بتا! تیری رضا کیا ہے؟

لیکن یہ منصب ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ محبت کا دل باتوں سے نہیں جیتا جا سکتا۔ بہت سے صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں جا کر حسن کی بارگاہ میں باریابی نصیب ہوتی ہے۔

مقرب اور مقبولِ بارگاہ بنا لینے کے بعد ہر ذات اپنی قدرت اور اپنے اختیار کی نسبت سے نوازتی ہے۔ محتاج ذات مقرب بنا لے گی تو احتیاج ختم نہ ہو گی۔ لامحتاج ذات نے ہاتھ پکڑ لیا تو کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ ادھر ارادہ ہوا اور ادھر پورا ہو کر رہے گا۔

دنیا کی بھی عجیب ریت ہے۔ یہاں کے بسنے والے رشتہ تو جوڑتے ہیں ان لوگوں سے جو خود محتاج ہیں۔ ان آستانوں کو اپنا حاجت روا سمجھ لیتے ہیں جن کی احتیاج کبھی ختم نہیں ہوتی اور چاہتے یہ ہیں کہ خود لامحتاج ہو جائیں۔ احتیاج کو لامحتاج ذات ہی ختم کر سکتی ہے۔ محتاج سے تعلق قائم ہو گا تو احتیاج ختم نہ ہو گی اور لامحتاج ذات سے تعلق قائم ہو گیا تو کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

مشیّتِ ربانی میں ڈھل جانے کے بعد بندہ، بندہ ہی رہتا ہے لیکن وہ صفاتِ ربّانیہ کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس کا ارادہ خدا کا ارادہ اور اور اس کی زبان خدا کی زبان ہو جاتی ہے۔ احتیاج ختم ہو جاتی ہے۔ اور اسے نائبِ حق کا منصب سونپ دیا جاتا ہے۔

موج و اضطراب

دل کی لگن کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا۔ دل میں اگر لگن موجود ہو، جذب و شوق کی دنیا آباد ہو، جذبات کی تند و تیز موجیں بہم اٹھ کر احساسات میں تلاطم پیدا کر رہی ہوں اور عزائم کو نئی تاب و تواں مل رہی ہو تو انسان پر ناکشودہ راہیں کھلنے لگتی ہیں۔ جن مشکلات کا حل ناممکن نظر آتا ہے، وہ بھی آسان ہونے لگتی ہیں، اور اگر سینے میں ذوقِ آرزو مردہ ہو گیا ہو، حیات کو نئی تابندگی عطا کرنے والے سوتے خشک ہو گئے ہوں تو حیات کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ معمولی مشکلات بھی انسان کو نیم مردہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ زندگی کی تڑپ اور ولولہ، زندہ اور بیدار دل کے جذبات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دل کو بیداری سوزِ آرزو سے ملتی ہے۔ مردہ قالب میں روح نہیں ہوتی، اور اس سے کسی معجزانہ کارنامے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسلام نے

اپنے ظہور کے ساتھ ہی مردہ دلوں کو زندگی عطا کی تھی۔ انہیں زندگی اور موت کے مفہوم سے آشنا کیا تھا۔ اسلام چلتی پھرتی لاشوں کو زندہ نہیں کہتا۔ اس کے نزدیک زندگی دل کی حیات کا نام ہے۔ دل کو خدا کی یاد سے زندگی ملتی ہے۔ عبد اور معبود کا رشتہ جب جڑ جاتا ہے تو دل میں حیات آفریں جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جذبات کا نیا سمندر سینے میں موجزن نظر آنے لگتا ہے۔ جس کی ہر موج حسین ہو، آویز، متنوع اور ولولہ انگیز ہوتی ہے جو سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دیتی ہے، ساحل کو آغوش میں لیتی ہے تو بہا کر لے جاتی ہے۔ موج کی فطرت میں اضطراب ہوتا ہے۔ وہ ازل سے مضطرب ہے، اور ابد تک مضطرب رہے گی۔ اضطراب ہی اس کا سرمایۂ حیات بنتا ہے۔ اور اضطراب ہی اس کی زندگی کا ضامن کہلاتا ہے۔ موج سے اضطراب کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کی تفریق ممکن نہیں اور اگر ان میں افتراق پیدا ہو جائے تو وہ دونوں کی فنا کا باعث ہوگا۔ موج اضطراب سے ہے اور اضطراب موج سے۔ جو دریا موج و اضطراب کی دولت سے محروم ہو، وہ اپنی تخلیق کے مفہوم سے نا آشنا رہے گا۔ مومن کا دل بھی مضطرب موجوں کا امین ہوتا ہے، کائنات کا سارا درد سمٹ کر اس کے سینے میں آجاتا ہے، سینۂ دریا پہ ابھرنے اور مچلنے والی موج دریا کے اندرونی ہنگاموں کی غماز ہوتی ہے کائنات کے سینے سے جو چیخ نکلتی ہے، وہ مومن کے

دلکو اک نیا اضطراب عطا کر دیتی ہے، جو دل کائنات کی چیخیں سن کر بے تاب
نہیں ہوتا! انسانیت کے درد سے بے تاب ہو کر اس کے مداوے کے
لیے مضطرب اور پریشان نہیں ہو جاتا وہ ایک شقی القلب انسان کا دل
تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے کسی صورت میں بھی مومن کا دل کہنا درست نہ
ہو گا۔ دل کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ جسم کے کسی حصے کو گزند پہنچے تو وہ سینے کے
اندر تڑپنے لگتا ہے۔ یہ کارخانۂ قدرت، اور یہ آب و گل کی دنیا جسے ہم کائنات
کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس میں مومن کی حیثیت دل کی ہے کائنات
کے سینے میں کانٹا بھی چبھ جائے تو مومن اس کی کسک اپنے دل میں محسوس
کرتا ہے لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہے، جب مومن کا دل بیدار ہو رہا ہے
سرمدی سرچشمۂ حیات سے بدستور فیضان پہنچ رہا ہو۔ بندے کے اضطراب
سے مولا خوش نہیں ہوتا۔ کسی نقّاش کو اپنے نقش کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی
خواہ وہ کتنا بھی غیر جاذب اور غیر دلچسپ کیوں نہ ہو۔ عبد کا معبود سے
رشتہ قائم ہوتا ہے۔ تو اس میں ربّانی صفات جھلکنے لگتی ہیں، وہ اپنے مولا
کی صفات کا مظہر اور آئینہ بن جاتا ہے۔ اسکا دل بھی بلا امتیازِ مذہب و
ملّت اور رنگ و نسل ان کی پریشانیوں پر کڑھنے لگتا ہے وہ ان کے درد
کو اپنا درد محسوس کر کے اس کے مداوے کی کوشش میں مصروف نظر آنے لگتا
ہے۔ آفتاب کا فیضان چمنستانوں اور خیابانوں تک ہی نہیں ہوتا۔ وہ

غلاظتوں پر بھی پر تو افگن ہوتا ہے اور ظلمتیں اس سے اکتسابِ نور کرتی ہیں۔
مومن کا دل بھی سرچشمۂ فیضانِ الٰہی ہے وہ ہر طرف تجلیاں بکھیرتا ہے،
ظلمتوں کو نور کے قالب میں ڈھالتا ہے اور دکھیا دلوں کے لیے مرہم شفا
ثابت ہوتا ہے۔ ان صفات کا حامل نہ ہو تو اسے سرچشمۂ فیضانِ الٰہی نہیں کہا
جا سکتا، وہ بخیل ہوگا اور بخیل، فطرت کا نمائندہ نہیں ہو سکتا۔

لگن کے کرشمے

ہر چیز میں ایک لذت ہے، خواہ وہ اچھی ہو یا بری! شرابی کو شراب
نوشی میں مزا آتا ہے، قمار باز کو قمار بازی میں راحت محسوس ہوتی ہے۔
راہزن راہزنی میں لذت محسوس کرتا ہے، اور ایک رحیم و کریم انسان
کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر اپنی راحتیں قربان کر دیتا ہے، تو وہ ایثار
میں لذت محسوس کرتا ہے۔

لذت دراصل اپنی ہی لگن کی ہوتی ہے کسی ذات سے لگن ہو تو اس
کی جفائیں بھی مزا دیتی ہیں، لگن نہ ہو تو وفائیں بھی مزا نہیں آتا فصاحت و بلاغت
سے لبریز تقریر بھی دل پہ اثر انداز نہیں ہوتی۔ ماں کو بچے سے چونکہ پیار
ہوتا ہے اس لیے اس کی توتلی باتیں اور شکستہ جملے بھی ماں کی روح میں

ایک مستی اور کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ توتلی زبان سے اماں کہتا ہے تو ماں کا دل مستیوں اور سرشاریوں سے بھر جاتا ہے کسی دوسرے کی فصیح و بلیغ تقریر ماں کے دل میں یہ مستی اور سرشاری پیدا نہیں کر سکتی۔ مستی اور سرشاری صرف لگن کا نتیجہ ہوتی ہے۔

لگن ہو تو پکارنے میں بھی مزا آتا ہے اور پکار سننے میں بھی راحت محسوس ہوتی ہے لگن جہاں بھی ہو گی اپنا اثر دکھائے گی۔ شراب مقصودِ حیات بن چکی ہو تو، اس کا ذکر بھی مزا دے گا۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ جب شرابی مل کر بیٹھتے ہیں تو شراب کی قسموں اور ان کی لذات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ تذکرہ بھی انہیں سرور بخشا ہے، سرور دراصل لگن کا ہوتا ہے۔ افیون کھانے والوں اور بھنگ پینے والوں کے لیے شراب کے تذکرے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، جو جس کا طالب ہو گا، اسی کو یاد کرے گا، اسی کو یاد کرے گا۔ اسی کے ذکر میں لذت محسوس کرے گا، احساسات کی دنیا پہ جو بھی چھایا ہو گا، اسی کی یاد آئے گی، اسی کا ذکر زبان پہ ہو گا اور اسی کی یاد لذتیں عطا کرے گی۔

بیمار جسم کو غذا کی لذت نصیب نہیں ہو سکتی، اور بیمار روح کو خدا کا نام لینے میں مزا نہیں آتا، تعلق ہی نہ ہو تو مزا کیسا؟ لگن ہی نہ ہو تو مستی کیسی؟ سوتیلی ماں کو بچہ لاکھ بار اماں کہہ کر پکارے، اس کی پکار بے اثر

ہوگی۔ نہ پکارنے والے کے دل میں کوئی مستانہ جذبہ پیدا ہوگا اور نہ ہی سننے والی ذات کی سماعت لذت گیر ہوگی دونوں لذت سے محروم رہیں گے۔ پکار وہی متاثر کر سکتی ہے، جو دل سے نکلی ہو۔ دل سے نکلی ہوئی صدا کبھی رائگاں نہیں جاتی وہ اثر انداز ہو کر رہتی ہے۔ جذبات میں ہیجان اور طوفان پیدا کر دیتی ہے۔ احساسات کا ایک ایک تار ہلا دیتی ہے۔ سوز و درد سے محروم اجنبی آواز نے کب کسی دل میں محبت کے جذبات پیدا کئے ہیں اور اسے سوز و درد سے آشنا کیا ہے؟ آشنائی ہی آواز میں سوز پیدا کرتی ہے، اور سوز سے شناسا کرنے کا موجب ثابت ہوتی ہے، بیگانوں کی آواز میں اثر نہیں ہوتا۔ بندے کا بھی جب مولا سے رشتہ جڑ جاتا ہے تو آواز میں خود بخود سوز و درد پیدا ہونے لگتا ہے۔ یاد بھی مزا دینے لگتی ہے۔ اور پکار بھی، اور یہی پکار اسکی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے

بیگانہ وار پکارنے سے نہ خود کو مزا آتا ہے، اور نہ یہ پکار حریم ناز کے پردوں میں کوئی جنبش پیدا کر سکتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی پکار کے ذریعے حریم جمال کے پردے بھی اٹھنے لگتے ہیں اور دل بھی لذات و کیفیات کا مخزن بن جاتا ہے۔ یہ سب لگن کے کرشمے ہیں اور باہمی نسبت و تعلق کی معجز نمائیاں۔

ایک مستی اور کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ توتلی زبان سے اماں کہتا ہے تو ماں کا دل مستیوں اور سرشاریوں سے بھر جاتا ہے کسی دوسرے کی فصیح و بلیغ تقریر ماں کے دل میں یہ مستی اور سرشاری پیدا نہیں کر سکتی۔ مستی اور سرشاری صرف لگن کا نتیجہ ہوتی ہے۔

لگن ہو تو پکارنے میں بھی مزا آتا ہے اور پکار سننے میں بھی راحت محسوس ہوتی ہے لگن جہاں بھی ہو گی اپنا اثر دکھائے گی۔ شراب مقصودِ حیات بن چکی ہو تو، اس کا ذکر بھی مزا دے گا۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ جب شرابی مل کر بیٹھتے ہیں تو شراب کی قسموں اور ان کی لذات کا تذکرہ کرتے ہیں، یہ تذکرہ بھی انہیں سرور بخشتا ہے، سرور دراصل لگن کا ہوتا ہے۔ افیون کھانے والوں اور بھنگ پینے والوں کے لیے شراب کے تذکرے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، جو جس کا طالب ہو گا، اسی کو یاد کرے گا، اسی کو یاد کرے گا۔ اسی کے ذکر میں لذت محسوس کرے گا، احساسات کی دنیا پر جو بھی چھایا ہو گا، اسی کی یاد آئے گی، اسی کا ذکر زبان پہ ہو گا اور اسی کی یاد لذتیں عطا کرے گی۔

بیمار جسم کو غذا کی لذت نصیب نہیں ہو سکتی، اور بیمار روح کو خدا کا نام لینے میں مزا نہیں آتا، تعلق ہی نہ ہو تو مزا کیسا؟ لگن ہی نہ ہو تو مستی کیسی؟ سوتیلی ماں کو بچہ لاکھ بار اماں کہہ کر پکارے، اس کی پکار بے اثر

ہوگی۔ نہ پکارنے والے کے دل میں کوئی مستانہ جذبہ پیدا ہوگا اور نہ ہی سننے والی ذات کی سماعت لذت گیر ہوگی دونوں لذت سے محروم رہیں گے، پکار وہی متاثر کر سکتی ہے، جو دل سے نکلی ہو۔ دل سے نکلی ہوئی صدا کبھی رائگاں نہیں جاتی وہ اثر انداز ہو کر رہتی ہے۔ جذبات میں ہیجان اور طوفان پیدا کر دیتی ہے۔ احساسات کا ایک ایک تار ہلا دیتی ہے۔ سوز و درد سے محروم اجنبی آواز نے کب کسی دل میں محبت کے جذبات پیدا کئے ہیں اور اسے سوز و درد سے آشنا کیا ہے؟ آشنائی ہی آواز میں سوز پیدا کرتی ہے، اور سوز سے شناسا کرنے کا موجب ثابت ہوتی ہے، بیگانوں کی آواز میں اثر نہیں ہوتا۔ بندے کا بھی جب مولا سے رشتہ جڑ جاتا ہے تو آواز میں خود بخود سوز و درد پیدا ہونے لگتا ہے۔ یاد بھی مزا دینے لگتی ہے۔ اور پکار بھی، اور یہی پکار اسکی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے

بیگانہ وار پکارنے سے نہ خود کو مزا آتا ہے، اور نہ یہ پکار حریم ناز کے پردوں میں کوئی جنبش پیدا کر سکتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی پکار کے ذریعے حریمِ جمال کے پردے بھی اٹھنے لگتے ہیں اور دل بھی لذات و کیفیات کا مخزن بن جاتا ہے۔ یہ سب لگن کے کرشمے ہیں اور باہمی نسبت و تعلق کی معجز نمائیاں

نشہ اور کیف

دل میں ایمان موجود ہو تو مشکلات کا ہجوم بندے کو مولا کے قریب کر دیتا ہے۔ بھڑ ولے اور ایمان کی قوت سے محروم انسان کے لیے معمولی مصیبت بھی گوناگوں پریشانیوں کا موجب بن جاتی ہے۔ آگ سونے کے حسن کو نکھار دیتی ہے اور ملمع کا کھوٹ ظاہر ہو جاتا ہے۔

بارگاہِ صمدیت میں شرفِ قبول حاصل کرنے والا حسن وہ نہیں جس کی شمع کو حوادث کے جھونکے بجھا دیں۔ یہاں اس حسن کی پذیرائی ہوتی ہے، اسے شایانِ توجہ سمجھا جاتا ہے جو مصائب و آلام کی آندھیوں میں صابر و شاکر اور اپنے مالکِ حقیقی کا ثناخواں رہے اور یہ انسان کی فطرت ہی کا حسن ہو سکتا ہے جس پر کسی حال میں آنچ نہیں آتی۔ اس کے چمنستان میں مہکنے والے پھول سدا بہار ہوتے ہیں جن پر خزاں کا رنگ نہیں چڑھتا۔ خدا تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ رکھنے والے انسان کے حالات کی طرفگی سے کبیدہ خاطر نہیں ہوتے۔ حوادث ان میں یاس پیدا نہیں کر سکتے وہ ہر غم ہر مصیبت اور ہر پریشانی میں اپنے رب سے وہی دشتہ قائم رکھتے ہیں جو انہوں نے اسے سمیع و بصیر اور قادر و قیوم جان کر قائم

کی ہوتی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ایک صدّیق انسان اور ہوس کے بندے کے نظریات میں بنیادی طور پر یہ فرق ہوتا ہے کہ صدّیق انسان محبوب کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو راہِ محبت کے ثمرات سمجھ کر خوش ہوتا ہے محبوبِ حقیقی کی وفا پر کامل بھروسے کے باعث مصائب کو بھی حکمتوں اور مصلحتوں پر محمول کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور جس شخص کے دل میں ایمان راسخ نہ ہو وہ ہر ناگواری کے پیش آجانے پر مضطرب ہو جاتا ہے۔ ذاتی اغراض اسے اس قدر مطلب پرست بنا دیتی ہیں کہ وہ زبان سے خدا تعالیٰ کے علیم و حکیم ہونے کا اقرار کرنے کے بعد بھی اپنی ہی مصلحتوں کو ترجیح دینے لگتا ہے خلافِ طبع امور پیش جانے کے باعث گھبراتا ہے۔ تلملاتا ہے اور پکارنے لگتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ گویا وہ بندہ ہو کر خالق کو اپنی مرضی کے تابع بنانا چاہتا ہے۔ اپنی رضا کو اس کی رضا پر فوقیت دیتا ہے' ایسا تعلق تو بندوں سے بھی نہیں نبھ سکتا۔ کسی بندے سے رشتۂ محبت استوار کرنے کے بعد اپنے کچھ عزیز ترین مفادات کی قربانی دینی پڑتی ہے اس کی رضا کے لیے اپنے مقاصد نظر انداز کرنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر دو دل جڑتے ہیں، محبت اور اعتماد کی فضا قائم ہوتی ہے۔ خود غرضی کے ساتھ قائم کیا ہوا تعلق تو بندے کے ساتھ بھی قائم نہیں رہ سکتا' بے نیاز

ذات ایسے تعلق کو کب قابلِ توجہ سمجھتی ہے؛ اسے تو انہی سوختہ جانوں کا تعلق عزیز ہوتا ہے جو رضا کے بندے ہوتے ہیں، کوئی حادثہ ان کے تعلق کی پائداری کو کمزور نہیں کر سکتا۔ وہ تو مصائب میں بھی اس احساس سے خوش ہوتے ہیں۔ کہ انہیں شایانِ توجہ سمجھا گیا ہے۔

اس صحابیؓ کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے
جسے مشرکین نے پکڑ کر مکہ میں سولی پہ لٹکا دیا تھا۔ اور وہ فرطِ مسرت
میں جھوم جھوم کر عاشقانہ اشعار پڑھنے لگا تھا۔ ان جان نثارانِ
رسولؐ کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے جو بدر و حنین میں زخمی
ہو کر گرتے وقت دوڑ کر حضورؐ کے قدموں پہ سر رکھ دیتے
تھے۔ اور یہ کہہ کر ابدی نیند سو جاتے تھے کہ رب کعبہ کی
قسم میں مراد کو پہنچ گیا۔

محبت کی مراد ارباب غرض کی مراد سے مختلف ہوتی ہے، دونوں میں کوئی تطابق نہیں ایک بامراد ہوتے ہیں اور ایک نامراد ایک کے مقدر میں راہِ محبت کے مزے ہوتے ہیں۔ اور ایک کی قسمت میں ہوس کی بے کیفیاں۔ ہوس کا پجاری محبت کا شہید نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔

بصارت اور بصیرت

نقش سے محبت نقّاش سے محبت کی دلیل ہوتی ہے تخلیق کے حسن و جمال کو نظر انداز کر کے نہ خالق کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے محبت قائم ہو سکتی ہے ہر تخلیق اپنے خالق کا آئینہ ہوتی ہے جس میں اس کی فنی لطافتوں اور عظمتوں کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے تخلیق کا مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ خالق کی طرف راہنمائی کرے۔ اس کی عظمتوں کو آشکارا کرے۔ نقش جب دل پر اپنی عظمت کا سکہ جما لیتا ہے تو نقاش کی عظمت خود بخود دل میں جاگزیں ہونے لگتی ہے اسی لیے قرآن میں جا بجا زمین و آسمان، چاند سورج، ستاروں، پہاڑوں، دریاؤں اور اسی نوع کی دوسری چیزوں کو غور سے دیکھنے کی تعلیم دی گئی ہے یہ تمام چیزیں آیاتِ الٰہیہ ہیں۔ رب تعالیٰ کی نشانیاں ہیں ان کے دیکھنے سے رب تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ باطل کوئی چیز بھی نہیں۔ ہر تخلیق کا ایک مقصد ہے کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ اس تک انسانی فکر پہنچے یا نہ پہنچے چاند سورج اور ستارے

بیکار نہیں بنائے گئے۔ دریاؤں کو بلاوجہ روانی نہیں دی گئی پہاڑوں کو بلا وجہ جلال و جبروت عطا نہیں کی گئی ہوا کا خرام بلا سبب نہیں صحرا کے سکوت میں بھی ایک نغمہ ہے۔ جسے بیدار دل ہی سن سکتے ہیں۔ لیل و نہار کی گردشیں اور وقت کی کروٹیں ایک نیا پیغام لے کر آتی ہیں۔ محبوب کے یہ قاصد نہ بلا سبب آتے ہیں نہ جاتے ہیں۔ گوشِ شنوا کوئی نہ ہو، پیغام بصیرت کوئی نہ سنے تو قاصدوں کی دوڑ دھوپ کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ جو دل ان قاصدوں کا پیغام سنتے ہیں انہیں بیداری نصیب ہوتی ہے۔ جو آنکھیں آیاتِ الٰہیہ کو دیکھتی ہیں انہیں بصیرت ملتی ہے۔ بصیرت اور بصارت سے محروم انسان نہ کچھ دیکھ سکتا ہے۔ نہ عبرت حاصل کر سکتا ہے عبرت بصیرت اور بصارت کی مقتضی ہے۔ اور یہ دولت انہی لوگوں کو ملتی ہے جو ہدایت کے متلاشی ہوتے ہیں طلب سے سینہ خالی ہو تو سامنے پڑی ہوئی نعمتوں سے بھی استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ استفادے کے لیے طلب کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بھوکا انسان روٹی کے چند ٹکڑوں کو بھی نعمت سمجھ کر شکر ادا کرتا ہے۔ اور طلب سے محروم کے لیے اعلیٰ غذائیں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جس دل میں معرفت شناسی کا جذبہ موجود ہو، اس کیلئے درختوں کے سبز پتے بھی معرفت کے دفتروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ایک شاخ، ایک ایک پتہ اور ایک ایک کونپل جہانِ معرفت کی طرف

رہنمائی کرتی ہے۔ دنیا کی نگاہوں میں وہ شخص ذی عزت قرار پاتا ہے جو خلاق ذہن کا مالک ہو جو نئی نئی اختراعات کرے۔ دنیا کا دامن اپنی ندرت کاریوں سے بھر دے لیکن خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ شخص عزت والا سمجھا جاتا ہے جس کا دامن پاک بازی کی نعمت سے مالا مال ہو خواہ اس نے زندگی بھر کوئی اختراع نہ کی ہو۔ دنیا کے سامنے کسی خوش گفتاری کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ ربانی نظریئے کے مطابق وہ تمام انسان گمراہ تھے جن کے دامن میں فہم و فراست کی متاع تو موجود تھی۔ لیکن انہوں نے انبیاءؑ کی تعلیم کو قبول نہ کیا۔ ان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ چلے۔ لق و دق صحرا میں سفر کرنے والا انسان خواہ کتنی بھی ذہانت کا ثبوت دے۔ کتنی بھی ندرت کاریوں کا مظاہرہ کرے۔ اگر وہ بروقت منزل پر نہ پہنچے مقصود سے غافل ہو کر اپنی توجہ دوسرے امور پر صرف کر دے۔ تو ہولناک آندھیوں اور تباہیوں کی نذر ہو کر رہے گا۔ ایسے انسان کو منزل رسیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ منزل انہی کو ملتی ہے جن کی نظر منزل پر ہو جو منزل کو مقصودِ حیات سمجھیں۔ خواہ راہ میں ان سے تعجب انگیز امور کا صدور نہ بھی ہو۔ آخرت میں انسان سے ذہانت کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا، اعمال کی پرسش ہو گی یہ سوال کیا جائے گا کہ اس منزل کے لیے کیا لائے ہو۔؟

بارگاہِ جمال

اہلِ دنیا کی تمام تر توجہ دنیوی مال و منال کی حفاظت و صیانت پر مرکوز ہوتی ہے۔ جان دے کر بھی وہ مال کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ ایمان جیسی دولت دے کر بھی اگر وہ یہ سمجھیں کہ مال کی حفاظت ہو سکتی ہے تو اس تجارت کو خسارے کا سودا نہیں سمجھتے۔ اہلِ آخرت کو ایمان عزیز ہوتا ہے اس لیے وہ ایمان کی حفاظت کو اپنا اوّلیں فرض جانتے ہیں اور ان کی ساری کوششیں اسی فرض کی تکمیل کے لیے صرف ہوتی ہیں۔ جان و مال کا زیاں ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا ایمان پر آنچ آجائے تو ان کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے ان کا دل صبر و سکون کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک عارف کے حالات میں مذکور ہے کہ انہیں مصیبت میں مبتلا دیکھ کر کسی نے اظہارِ تاسف کیا تو فرمانے لگے کہ اَلحمدُ لِلّٰہ، مصیبت میں مبتلا ہوں، معصیت میں نہیں۔ اہلِ ایمان کے نزدیک مصیبت میں مبتلا ہونا کوئی بات نہیں، مصیبت کو وہ تقربِ الٰہی کا ذریعہ جانتے ہیں اور اپنے رب سے اس کے اجر و ثواب کے امیدوار رہتے

ہیں۔ معصیت کا ارتکاب ان کے نزدیک عظیم بلا کی حیثیت رکھتا ہے وہ اسی
کا ماتم کرتے ہیں، اسی پر مضطرب ہوتے ہیں اور اسی سے نجات حاصل کرنے
کے لیے بارگاہِ صمدیت میں ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ مصیبت میں انہیں قناعت
نصیب ہوتی ہے۔ جس مصیبت میں انسان کا دل مطمئن ہو، اسے صبر و سکون
کی دولت نصیب ہو، وہ خدا کا عذاب نہیں رحمت ہوتی ہے۔ انجام کار اس
کے ثمرات ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ مصیبت وہ قابلِ ماتم ہوتی ہے جس میں مبتلا
ہونے کے بعد انسان کے ہاتھ سے صبر و سکون کا دامن چھوٹ جائے اور
وہ عقل و شعور سے بیگانہ ہو کر قلق و اضطراب کا اظہار کرنے لگے۔ مصیبت
کے رحمت اور زحمت ہونے کا معیار انسان کا وہ حال ہوتا ہے جو اس
کی باطنی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ کیفیت سکون پذیر ہو تو یہ رحمت کی
دلیل ہوتی ہے۔ خدا کی رحمت شاملِ حال نہ ہو تو مصیبت میں صبر کی توفیق
نہیں ملتی۔ صبر کی توفیق انہی کو ملتی ہے جنہیں مصیبت کے ذریعے بندگانِ
خاص میں شامل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح اہلِ دنیا پر اپنے خاص بندوں
کی عظمت آشکارا کی جاتی ہے اور انہیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارے بندے
ابتلا و امتحان میں مبتلا ہونے کے باوجود کس قدر صابر و شاکر ہیں۔ ان کی
زبان شکوہ و شکایت سے آلودہ نہیں ہوتی، ہمارے ساتھ انہوں نے
جو وضع قائم کی ہے، وہ کسی حال میں نہیں بدلتے۔ احوال کا تغیر جذبات

کے کیف و کم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ رنج و راحت میں انسان کے جذبات و خیالات بدلتے رہتے ہیں، تو حال ان سے اثر پذیر ہوتا ہے وضع میں بھی اسی لیے تغیر پیدا ہونے لگتا ہے۔ خاصانِ بارگاہ کے احوال کو زمانے کے تغیرات منقلب نہیں کر سکتے ان کے احوال میں جو بھی تغیر واقع ہوتا ہے۔ وہ محبوبِ حقیقی کے مزاج کے تغیر کا اثر اور نتیجہ ہوتا ہے۔ مصیبت میں بھی انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ خدا تعالیٰ ان سے خوش ہے، رضا کی دولت انہیں نصیب ہے تو شدائدِ زمانہ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ طبیعت میں اضمحلال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انہیں یہ گمان گزرنے لگے کہ محبوبِ حقیقی کی نظر ان سے پھر گئی ہے، وہ ان سے خوش نہیں، یہی احساس انہیں مضطرب کرتا ہے۔

دنیا کے طالب کی نظر خدا کی رضا پر نہیں ہوتی، وہ مال و دولت کا طلب گار ہوتا ہے اور اسی آرزو میں زندگی گزار دیتا ہے۔ آرزوؤں کے بت متشکل ہو کر سامنے آجائیں تو وہ ان کی پوجا میں لگ جاتا ہے انہی معبودوں کی پرستش میں اس کی زندگی بسر ہونے لگتی ہے اور اسے یہ احساس تک باقی نہیں رہتا کہ خواہشات کے یہ لات و منات اسے خدا کی بارگاہ سے کس قدر دور لے آئے ہیں۔ بتوں کے قرب کو وہ خدا کے قرب پر ترجیح دیتا ہے۔ انسان کی جبیں جب خواہشات کے لات و

منات کے سامنے جھکنے لگے تو اسے خدا کی بارگاہ کے سجدوں کی لذت نصیب نہیں ہوتی۔ بارگاہ قدس کے سجدوں کی لذت انہی دلوں کو نصیب ہوتی ہے جن میں عشقِ الٰہی کی آگ فروزاں ہو، جن میں طلب ہو تو اسی ذات کی جو خالق حسن وجمال ہے، تڑپ ہو تو وہ بھی اسی کی رضا کی، قلق و اضطراب ہو تو اس کا پروردگار بھی عشقِ الٰہی کا کوئی فروزاں اور تاباں جذبہ ہو۔ دنیا کے غم تو ہر انسان کو پریشان کرتے ہیں لیکن عقبےٰ کا غم انہی دلوں کو نصیب ہوتا ہے جنہیں خدا تعالیٰ اپنی محبت کے فیوض کے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ وہ ذات بڑی غیور ہے، خواہشات کے بتوں کے پجاریوں کو اپنی محبت کا غم ودیعت نہیں کرتی، یہ دولت انہی کو تفویض ہوتی ہے جنہیں اپنا سمجھا جاتا ہے اور انہیں اس امانت کا اہل خیال کیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے مقبولوں کو وہ غم دونوں جہان کی راحتوں سے عزیز ہوتا ہے جو واصلِ ذات کر دے، محبوب حقیقی کے قرب سے نواز دے، وہ ان راحتوں کو عذاب الیم جانتے ہیں جو انکے اور مالک حقیقی کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں۔ حجاب دوری میں ہے قرب میں نہیں۔ قرب نصیب ہو تو کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ حجاب باقی ہوں تو قرب کی تمنا بے کار ہوتی ہے۔ حجاب نام ہے اپنی آرزوؤں کی ان طلسم بندیوں کا، جن کی چمک دمک انسان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور وہ رضائے الٰہی کے حسن وجمال کو دیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ خواہشات مٹ جاتی ہیں، آرزوؤں کا

طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور اپنی رضا، رضائے دوست میں فنا ہو جاتی ہے تو کوئی حجاب نہیں رہتا۔ قرب بھی عطا ہوتا ہے اور جمال بھی، لذتیں بھی، اور سرمستیاں بھی، کیفیتیں بھی اور کیف بار ساعتیں بھی، یہ سب فیضانِ جمال کی معجز نمائیاں ہیں۔ محجوب انسان کو اس بارگاہ میں کہاں دخل نصیب ہو سکتا ہے؟

خواجہ اور تاجر

تعلق باللہ کا صحیح لطف انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے جن کی طلب کے زاویے درست ہوں۔ تاجر نہ محبت کی بو سونگھ سکتا ہے نہ کسی دوسری روح میں مستی اور سرشاری پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے تعلقات کی اساس لین دین پر ہوتی ہے۔ مستی اور سرشاری لین دین کا خاصہ نہیں۔ اس کا تعلق روحانی روابط سے ہے۔ جہاں روح کا تعلق ہو گا مستی بھی رہے گی اور روح کیف و سرور کے عالم میں مست و سرشار بھی رہے گی۔ تعلق جس نوعیت کا ہو گا ویسے ہی اثرات مرتب ہوں گے۔ باغ میں عطار، مالی اور شاعر کا گذر ہو تو پھولوں کے حسن و جمال اور ان کی بُو باس سے ہر ایک جداگانہ اثر قبول کرے گا۔ عطار عرق کھینچنے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھے گا۔ اسے وہ کیفیت حاصل نہ ہو گی، جو شاعر کی روح پر مدہوشیاں طاری کر دے گی۔ اور

اس کے نطق و لب سے شعر کے نغمے پھوٹنے لگیں گے۔ مالی کا اپنا اندازِ فکر ہو گا۔ ایک ہی پھول کا جمال مختلف انسانوں میں مختلف کیفیات پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔ اس کے اختلاف سے پھول کے اثرات بھی بدل جاتے ہیں طلب کے زاویوں کے مختلف ہونے کے باعث ہر شخص نے جداگانہ اثر قبول کیا۔ عطار اگر یہ کہے کہ جو کیفیتیں شاعر کو نصیب ہوئی ہیں ان سے مجھے حصہ کیوں نہیں ملا؟ تو یہ اس کی بھول ہو گی۔ کیفیتیں صرف محبت کو عطا ہوتی ہیں۔ تعلق کی جیسی نوعیت قائم کر لی جائے ویسا اثر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

نشاطِ روح بھی ہیں اور تکلیفِ تمنا بھی!
حقیقت میں وہ ہیں ویسے ہی جیسا ہم گماں کر لیں

اسی لیے بندے کو مولا سے تعلق قائم کرنے سے پہلے طلب کے زاویے درست کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایمان کیا ہے؟ یہ تعلقات کی درستگی اور استواری ہی کا نام تو ہے۔ وہ پیمانِ محبت جو اپنی عبودیت کے اعتراف اور اس کی حاکمیت کے احساس کے ساتھ بندہ مولا سے باندھ لیتا ہے اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ اور اعمال صالحہ اسی کا نتیجہ اور ثمر ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ تو خیر ایک بے نیاز ذات ہے تمام مخلوق اس کی مطیع و فرماں بردار بن جائے تو اس کی خدائی کی لامحدود وسعتوں میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی باغی ہو کر اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ ایک معمولی درجے کے انسان سے

بھی اس شرط پر تعلق قائم نہیں رہ سکتا کہ اسے ہر مطالبہ تسلیم کرنے کے لیے مجبور کیا جائے، ہر آرزو کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے۔ ایسے تعلقات میں نہ استواری قائم رہ سکتی ہے، نہ انہیں محبت کے لیے سرمایۂ نازش سمجھا جا سکتا ہے۔ محبت کے لیے وہی تعلقات سرمایۂ نازش و افتخار سمجھے جا سکتے ہیں جن کی اساس خلوص پر مبنی ہو جہاں اپنے مفاد سے زیادہ سامنے والی ذات کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کا احساس موجود ہو۔ صحابہؓ کے متعلق قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے کہ ہم ان سے راضی ہو گئے اور وہ ہم سے راضی ہیں۔ تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان نفوسِ قدسیہ نے ایمان لانے کے بعد اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بساط لپیٹ کر رکھ دی تھی۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ اور وہ یہ کہ ہر چیز کی قربانی دے کر وہ خدا کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ جہاں سامنے والی ذات کی رضا مقصودِ حیات بن جاتی ہے، وہاں اپنی رضا کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ دوسرے کی رضا کے ساتھ ساتھ اگر اپنا مفاد بھی عزیز ہو، تو اسے پیمانِ محبت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خالصتاً کاروباری تعلق ہوتا ہے۔ اور ازل سے محبت کی یہ ریت ہے کہ وہ سرِ مو بھی غیر کی شرکت گوارا نہیں کرتی، مفاد کا ہلکا سا تصور بھی آ جانے سے یہ آئینہ گہنا جاتا ہے۔ اس کی تو شان ہی بے رنگ رہنے میں ہے اس گلستان میں تو بہار ہی اس وقت آتی ہے جب آرزوؤں اور تمناؤں کا خون پیش کیا جاتا ہے۔ اپنے احساسات کی قربانی دینے کے بعد

محبت کے دل میں جگہ مل سکتی ہے اور انسان جب بارگاہ محبت میں سرخرو اور کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی عظمتوں کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ ہوس باریابی عطا کرنے کے بعد دھتکار دیتی ہے۔ اس کا تعلق اسی وقت تک کیلئے ہوتا ہے۔ جب تک اس کی مطلب برآری ہوتی رہے محبت کا یہ قانون نہیں وہ خود مقبول ہے اور اس کا چاہنے والا بھی مقبول و محبوب ہوتا ہے۔

تجلیات

جسم و روح کے اتصال کا نام زندگی ہے اور ان دونوں کی مفارقت کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے جسم اسی وقت تک زندہ کہلا سکتا ہے جب تک اس میں روح جاری و ساری ہو۔ روح نکل جانے کے بعد جسم بیکار ہو جاتا ہے۔ اس میں زندگی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی اور نہ ہی اس سے کسی ایسی حرکت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جو خالصتہً روح کا فیضان ہو۔ جس طرح جسم کی حیات روح پہ موقوف ہے ایسے ہی دل کو یاد الٰہی سے زندگی ملتی ہے۔ محبت الٰہی دل میں موجود ہو۔ تو دل زندگی پاتا ہے۔ اور اس سے ان تمام امور کا صدور ممکن ہوتا ہے جو زندہ دل کے لوازم کہلا سکتے ہیں۔ کیف و سرور بھی زندگی اور توانائی

کے لازمی ثمر ہوتے ہیں۔ جوانی کا نشہ اور تازہ خون کا طغیان ان چیزوں کا خالق ہوتا ہے۔ ضعف و نقاہت کے باعث انسان جب نیم مردہ ہو جاتا ہے تو اس سے کسی عظیم کارنامے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حیات کا نشہ اور زندگی کا کیف و سرور ہی انسان کو جانبازیوں اور سرفروشیوں پہ آمادہ کر سکتا ہے۔

دل کی حیات کا بھی یہی حال ہے، اسے بھی یادِ الٰہی سے زندگی نصیب ہو تو وہ زندہ کہلا سکتا ہے، اور اس سے زندگی کے آثارِ ظاہر کا سراغ مل سکتا ہے۔ خدا کی محبت کے نکل جانے کے بعد وہ صرف گوشت کا لوتھڑا رہ جاتا ہے، اور ایسے لوتھڑے کو دل کہنا صحیح نہیں۔ گوشت کا لوتھڑا تو حیوانوں میں بھی موجود ہوتا ہے۔

مومن کا دل جو عرشِ الٰہی ہے جس سے حیات کیف گیر ہوتی ہے، جو حیات افروز اور حیات آفریں ہے۔ اسے گوشت کے لوتھڑے سے کیا نسبت؟ گوشت کا لوتھڑا تو روح نکل جانے کے بعد زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اور کوئی سلیم الفطرت انسان اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ رب تعالیٰ سے یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے بدبودار لوتھڑے کو اپنی جلوہ گاہ بنائے گا۔ اور اسے عرشِ الٰہی کہا جا سکے گا۔

عرشِ الٰہی تو یہ اس وقت بنتا ہے جب حسنِ مطلق کے جلووں کا مسکن بن جائے، مکان کی زیب و زینت سے اچھے مکین کی موجودگی کا اندازہ

لگایا جاسکتا ہے، جس گھر میں چاروں طرف گندگی کے انبار پڑے ہوں۔ اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی ٹھہرنا دشوار ہو، اس کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس میں کوئی لطیف مزاج قیام کرے گا؟ اچھے مکین کو بسانے کے لیے گھر کا غلاظتوں سے پاک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا مکین بسانا مقصود اسی نسبت سے گھر کی صفائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ بعض لوگ مکان کرایہ پر لیتے وقت غایت درجہ کی لطافتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ انہیں پارٹنر شپ بھی منظور نہیں ہوتی۔ انسان بھی عجیب واقع ہوا ہے۔ وہ دل کو غلاظتوں سے پاک کرنے کے لیے بھی تیار نہیں اسی دل میں اس نے شیطان کو بھی بسا رکھا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اسی میں خدا بھی آموجود ہو۔ قاعدے اور دستور کی بات ہے کہ ایک کے آنے کے لیے دوسرے کو جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ دو متضاد قوتیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ دل یا نفرت کا مقام بن کر رہے گا، یا محبت کی جلوہ گاہ، نفرت شیطان کی میراث ہے، اور محبت تجلیاتِ ربانی کا پرتو، دونوں کی ایک جگہ گنجائش ممکن نہیں۔

جس ذات سے تعلق قائم ہو اس کی میراث مل کر رہتی ہے۔ شیطان سے تعلق ہو تو صفات میں اسی کے اثر کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ رحمٰن سے رشتہ قائم ہو جائے، تو حیات رحمانی صفات سے متصف ہوئے

بغیر نہیں رہ سکتی تعلق جیسا ہوگا، اثر بھی ویسا ہی ظاہر ہو کر رہے گا اب یہ انسان کے اپنے ذوق پر موقوف ہے کہ وہ ربانی صفات سے متصف ہو کر حیات کو خوشگوار بنا لے یا شیطان کی اقتدا میں خسارے کا سودا قبول کرے۔ اختیار اسے دونوں کا دے دیا گیا ہے۔

چند نظائر

ایمان قلبی تصدیق کا نام ہے۔ زبانی اقرار تو محض علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی صداقت کی تاب شہادت دے تو اسے ایمان کہا جائے گا۔ زبان سے اقرار کرنے کے بعد جن لوگوں نے استقامت اختیار کی۔ قرآن انہی کی تعریف کرتا ہے جو لوگ زبان سے اقرار کرتے تھے اور ان کے دل اسلام کی صداقت پر مطمئن نہ تھے، انہیں منافق کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ نظریہ خواہ کوئی بھی ہو، اس کا زبانی اقرار کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ تا آنکہ انسان اس کے لیے قربانی دینے پر آمادہ نہ ہو، شہید کے مقام و مرتبہ کی اسی لیے تعریف کی گئی ہے کہ وہ اپنے عمل سے اسلام کی صداقت کی شہادت دیتا ہے۔ صحابہؓ کو بھی جو اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہیں اپنی زندگی میں حضورؐ کی شہادت

کے جو مواقع نصیب ہوئے، انھوں نے ان کے ایمان کو اس قدر مضبوط اور مستحکم بنا دیا کہ قرآن ان کا قصیدہ خوان بن گیا۔ آج کی مہذب دنیا کو ایمان کے دعوی کے باوجود اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن عرب کے صحرا نشینوں نے حضور کو خدا کے رسول کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تو ان کے دل ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو گئے۔ معرکۂ خندق کے وقت مسلمانوں کی کیا حالت تھی؟ کفر اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا اور وہ اپنی حفاظت کے لیے مدینہ کے گرد خندق کھود رہے تھے۔ خندق کھودتے وقت جب ایک چٹان نکل آئی تو صحابہؓ نے اپنی مشکل کا حضورؐ سے ذکر کیا۔ حضورؐ نے کدال لے کر تین ضربوں سے چٹان توڑ دی اور اس کے بعد صحابہؓ کو شام، روم اور ایران کے فتح ہونے کی بشارت دی۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ کدال کے چٹان پہ لگنے سے جو روشنی نکلی ہے اس میں میں نے شام و روم کے محلات بھی دیکھ لیے ہیں۔ ایران فتح ہونے کے بعد جو فتوحات تمہیں نصیب ہوں گی۔ کدال لگنے سے پتھر سے نکلنے والی روشنی میں میں نے ان فتوحات کا مشاہدہ بھی کر لیا ہے۔ شاہ ایران کی لڑکی کے کنگن بھی دیکھ لیے ہیں۔ شہزادی کے کنگن میرے ایک صحابی سراقہؓ کو پہنائے جائیں گے۔

زبانِ نبوت سے یہ بشارت سن کر صحابہؓ نے بالاتفاق حضورؐ کی

تصدیق کی۔ ایک صحابی کو بھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ مدینہ جو ایک مختصر سی بستی ہے، جسے ہم نے جائے پناہ کی حیثیت سے اختیار کیا ہے اس میں تو ہماری جانیں محفوظ نہیں۔ روم و شام اور ایران کی عظیم سلطنتوں کو ہم کیسے فتح کر سکتے ہیں؟ پتھر سے نکلنے والی روشنی میں حضورؐ نے شام و روم اور ایران کے محل کیسے دیکھ لیے؟

صحابہؓ نے دل سے حضورؐ کی تصدیق کی۔ آج بعض لوگ معجزات نبوی سے انکار کرتے ہیں۔ معراج جسمانی اور شق القمر کا ذکر سن کر زخمی ناگن کی طرح بل کھانے لگتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مدینہ کے محصور مسلمانوں کو دنیا کے عظیم ترین ممالک کے فتح ہونے کی بشارت دینا شق القمر کے معجزے سے کیا کم ہے؟

شام، روم اور ایران کے مقابلے میں اس وقت مدینہ کی وہی حیثیت تھی جو آج کی دنیا میں امریکہ، برطانیہ اور روس کے مقابلے میں کسی معمولی سی بستی کی ہو سکتی ہے۔ صحابہؓ کو یقین تھا کہ حضورؐ نے جو فرمایا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ صحابہؓ نے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ جن فتوحات کی بشارت دی جارہی ہے وہ ہمیں کب نصیب ہوں گی؟ حالانکہ ان کے پریشان کن حالات اس امر کا تقاضا کرتے تھے کہ وہ پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے آسودگی کی آرزو کریں۔ کم از کم یہی کہہ دیا ہوتا کہ حضورؐ دعا فرمایئے یہ فتوحات جلد نصیب ہوں، تاکہ افلاس و غربت سے نجات

حاصل ہو سکے لیکن اس باب میں ان کی مکمل خاموشی اس امر کی دلیل ہے، کہ ان کے نزدیک اصل چیز نہ فتوحات تھیں اور نہ آسودہ زندگی، خدمتِ اسلام اور اطاعتِ رسولؐ ان کا مقصودِ حیات تھی - بیکار باتوں کے لیے زبان اسی وقت کھلتی ہے جب قوتِ عمل اور اطاعت کا جذبہ مفقود ہو۔ عشق ایسی باتوں کی کہاں اجازت دیتا ہے؛ اس کی تو فطرت ہی تسلیم و رضا ہے۔

لذتیں اور راحتیں

انسانی عظمت کا جو معیار دنیا والوں نے قائم کر رکھا ہے وہ خدا تعالیٰ کے اس قائم کردہ معیار سے یکسر مختلف ہے جس کی بنا پر بندہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول قرار پاتا ہے۔ اہل دنیا کی نظر میں ہر وہ انسان مکرم و محترم اور ذی عظمت ہوتا ہے جس کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو، اونچی اونچی بلڈنگیں ہوں، ہر وہ چیز موجود ہو جو انسان کی دنیوی حیات کو خوشگوار بنا سکے۔ دنیا والوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ راحت کے یہ ساز و سامان اس نے کن ذرائع سے حاصل کیے ہیں، اس کی یہ تمام عشرت کوشیاں اور عشرت کے ساز و سامان ربانی قوانین سے بغاوت و انحراف کا نتیجہ تو نہیں، قوانین فطرت کی پامالی کے بعد تو اس نے یہ آسائشیں حاصل نہیں کیں، یہ آسائشیں

اگر خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا نتیجہ ہوں، تو اسلام کی نگاہ میں یہ خسارے کا سودا ہوتا ہے، ایسا انسان نہ خدا کی نگاہ میں مقبول بن سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کے محبوب علیہ السلام کی بارگاہ مقبولیت کی سند حاصل کر سکتا ہے مقبولیت اور محبوبیت کی سند صرف انہی لوگوں کو ملتی ہے جو خدا تعالیٰ اور اسکے حبیب اکرم کی بنائی ہوئی راہ پر گامزن ہو کر اپنے دامن میں ابدی سعادتیں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ ان کا دامن از راہِ دنیا سے خالی ہو۔ اور راحت و سکون کا کوئی لمحہ انہیں نصیب نہ ہو سکے۔ ان کے لباس کی بوسیدگی اور سامان کی حیات کی بے سرو سامانی اہل دنیا کے نزدیک خواہ کتنی بھی ناقابل التفات کیوں نہ ہو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک مکرم و محترم ہوتے ہیں۔ بارگاہِ صمدیت سے انہیں مقبولیت کی سند عطا ہوتی ہے، اور ان کا رتبہ قدسیوں سے فزوں ہوتا ہے۔ ایسے انسانوں کو خدا تعالیٰ اپنے اس عظیم کرم سے نوازتا ہے۔ کہ انہیں کچھ نہ ہونے کے باوجود محرومی کے احساس سے دوچار نہیں ہونے دیتا۔ رضوانِ الٰہی کی جو سند انہیں ملتی ہے وہ ان کی ڈھارس بندھاتی ہے، وہی طمانیت کا احساس بن کر روح و قلب میں پیوست ہو جاتی ہے اور وہ فقیری میں وہ مزے لوٹتے ہیں جو شاہوں کو نصیب نہیں ہوتے۔

خوشی اور غم کا تعلق مادی ساز و سامان کی فراوانی سے نہیں طمانیت خالصتاً عطیۂ ربانی ہے۔ بعض لوگ سب کچھ ہونے کے باوجود حقیقی

مسرت سے محروم رہتے ہیں اور بعض کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی سکون کی دولت سے بہرہ ور کہلاتے ہیں۔ روحانی تسکین اور حقیقی مسرت اگر جنسِ بازار ہوتی تو یہ جنس غریبوں کے دامن میں نہ آتی۔ سرمایہ دار اور منافع خور اسے خرید کر اپنے دامن میں ڈال لیتے۔ لیکن جو خدا تعالیٰ اس کائنات پر بے لاگ قانون کے ساتھ فرمانروائی کر رہا ہے، انسانی عقل و شعور اس کی مصلحتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے جہاں اس کے حکم کی مصلحتیں کارفرما ہوں، وہاں محدود ذہن رکھنے والے انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ انسان تو ابھی تک اپنے ہی خیر و شر کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھ سکا۔ اس کی ان حکمتوں کو کیسے سمجھ سکتا ہے جن کا تعلق اس کے فہم و ادراک کی دسترس سے باہر ہے۔

حیات کی خوشگواریوں اور ان کی تمام تر لذات کو اس علیم و حکیم اور قادر و قیوم ذات نے انسانی عقل کی تمام تر طرفہ کاریوں کے باوجود ابھی تک جنسِ بازار نہیں بننے دیا۔ یہ چیزیں بکاؤ مال نہیں یہ جنس صرف ایک ہی دکان سے مل سکتی ہے۔ اور وہ اس کی مشیّت اور ارادے کی دوکان ہے جہاں اس کا ارادہ کارفرما ہو۔ وہاں مسرتیں ہوتی ہیں، لذات ہوتی ہیں کیف و سرور ہوتا ہے۔ اور ذوق و مستی کی جنس کی غایت درجہ ارزانی ہوتی ہے۔ آنسوؤں کی فراوانی میں بھی ایک تہی دست انسان وہ لذات حاصل کر لیتا ہے۔ جو قہقہوں کے بازار میں نہیں ملتیں۔ قہقہوں میں بھی

انسان زندگی کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا اور آنسوؤں کی رم جھم میں اسے طمانیت نصیب ہو جاتی ہے۔ طمانیت رضوانِ الٰہی کا ثمر اور نتیجہ ہوتی ہے۔ مصیبت میں انسان کی جو ڈھارس بندھ جاتی ہے اسے جو سکون حاصل ہوتا ہے اور اسے مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے جو تاب و تواں ملتی ہے آخر وہ کیا چیز ہے؟ وہ کرم ہی تو ہوتا ہے جو طمانیت کا احساس بن کر روح کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور یہی کرم روح کو سرشاریوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ لذت اور سرشاری تعلق کے استحکام کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس ذات سے تعلق ہو، اس کے ساتھ مصائب کی زندگی گزارنے میں بھی مزا آتا ہے اور جہاں تعلق نہ ہو وہاں راحتیں بھی مزا نہیں دیتیں۔ صحابہؓ کا چونکہ حضور حضورؐ کی ذات سے تعلق تھا، اس لیے انہیں مصیبت میں بھی مزا آتا تھا۔ قرب کی سرشاریوں کی لذتیں ان کے مصائب کے احساس کو ختم کر دیتی تھیں اور انہوں نے مصائب کی زندگی میں اس احساس کو کبھی قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ کہ ماضی میں زندگی کیسے آرام سے گزرتی تھی؟ وہ ماضی کی راحتوں پر ان مصائب کو ترجیح دیتے تھے۔ جو انہیں اسلام لانے کے بعد بارگاہِ نبویؐ سے وابستہ ہو کر پیش آ رہے تھے۔

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

درد اور دوا

ایک ہی غذا مختلف انسان کھاتے ہیں لیکن مزاج کی نسبت سے
وہ خون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مزاج اگر صفراوی ہو تو وہ غذا کو صفرا میں
ڈھال لیتا ہے۔ سوداوی مزاج انسان کے جسم میں غذا کھانے کے بعد
سودا کا اضافہ ہونے لگتا ہے، اور بلغمی مزاج میں غذا پہنچ کر بلغم بن جاتی
ہے، بچہ، بوڑھا اور جوان بھی ایک ہی غذا سے مساوی طور پر مستفیض نہیں
ہوتے، بچے کا معدہ مرغن غذا کو ہضم کرنے سے انکار کر دیتا ہے، جوان کے
جسم میں پہنچ کر وہی غذا تازہ خون بن جاتی ہے، اور اس کی رگوں میں
جوانی کا نشہ بن کر دوڑنے لگتی ہے، بوڑھے اور بیمار جسم میں اسی غذا
سے کئی خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ غذا پر ہی کچھ موقوف نہیں، قدرت
کے مختلف اور رنگارنگ مظاہر سے انسان مختلف اثر قبول کرتا ہے۔
قوسِ قزح کی رنگینیاں اور پھولوں کی دل آویزیاں ایک شاعر مزاج
انسان کی روح کو مست و سرشار کر دیتی ہیں، اور ذوقِ سلیم سے محروم
انسان ان کے قریب سے گزر جاتا ہے، نہ اس کی روح میں کوئی ہستی

پیدا ہوتی ہے، اور نہ ہی ان کا جمال اس کی طبع میں کوئی شگفتگی پیدا کر سکتا ہے۔ چکور کو بعض لوگوں نے چاندنی رات میں مست و سرشار دیکھا ہے اور اس کے دلنواز نغمے سنے ہیں۔ چاندنی چکور کی قلبی کیفیتوں کو جس انداز سے بیدار کرتی ہے، وہ صرف اسی کا حصّہ ہیں۔ زاغ و زغن چاندنی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ نور خواہ کسی رنگ میں ہو، انہی لوگوں کو متاثر کرے گا جن کے ضمیر پاک ہوں، جن کی نگاہیں روشن ہوں۔ اور جنہیں نور سے ازلی مناسبت ہو۔ مناسبت کے بغیر نہ حسن مزا دیتا ہے نہ نغمہ، زاغ و زغن کی بے کیفیوں سے چاندنی کے حسن کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، چاندنی کے حسن کو سمجھنے کے لیے چکور کی کیفیتوں کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے نور محمدی کو صدیق رضؓ و فاروق رضؓ کے آئینے میں دیکھا ہے، انہیں مستیاں بھی ملی ہیں۔ اور سرشاریاں بھی، ابوجہل کی میراث پانے والوں کی نگاہوں پر ہمیشہ حجاب رہا ہے، وہ حجاب میں پیدا ہوئے ہیں، اور حجاب ہی میں مر جائیں گے۔ حجاب ہی ان کا مقدر رہے۔ ان کی قیل و قال کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ قیل و قال کو محبت ختم کرتی ہے۔ محبت جب دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے تو قیل و قال نہیں رہتی۔ اطاعت ہوتی ہے، فرمانبرداری ہوتی ہے اور دل محبت کے جذبات سے لبریز رہتا ہے۔ عقل شکوک و شبہات کا دامن پھیلاتی

ہے۔ بحث و تکرار کا آغاز کرتی ہے۔ اور اس سلسلے کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ قیل و قال کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے۔ لیکن محبت بحث و تکرار کے تمام دفتر سمیٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اسے اطاعت میں مزا آتا ہے کیفیتیں ملتی ہیں، سرشاریاں عطا ہوتی ہیں، اور مستیوں سے دل لبریز رہتا ہے۔ ذوق و شوق کی دنیا کے دروازے عقل پر ہمیشہ بند رہے ہیں۔ اسے اس باغ کی بو سونگھنا نصیب نہیں ہوئی۔ محبت نے ہمیشہ محبت کے لیے دروازے کھولے ہیں محبت، محبت کی منتظر رہی ہے۔ محبت نے محبت کی ہم آغوشی کے مزے لوٹے ہیں، حال سنا ہے تسکین دی ہے وہ تسکین بن کر دل میں سمائی ہے، ناصر بن کر میدانوں میں آئی ہے، زخمی دلوں پر مرہم رکھا ہے، بیماروں کا مداوا کیا ہے اور تسکین سے محروم دلوں کو تسکین بخشی ہے۔ محبت بھکاری بن کر محبوب کے دروازے پر آئی ہے تو کبھی نامراد نہیں لوٹی اسے طلب سے سوا ملا ہے۔ توقع سے زیادہ کرم کی مستحق قرار پائی ہے، قرار اس کا حصہ ہے۔ تسکین اس کی دولت ہے، اعتماد اس کا سرمایہ ہے، یہاں بھی اور وہاں بھی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، قبر میں بھی اور حشر میں بھی، غیب میں بھی اور حضور میں بھی۔ اس کا غیبہ بھی حضور ہوتا ہے اس کا اضطراب بھی تسکین کہلاتا

ہے، اس کا انتظار بھی وصل ہوتا ہے۔ اور اس کا بُعد بھی قرب کہلاتا ہے
وجود کے کٹھن معرکے ہوں تو محبت ناصر بن کر خون میں دوڑنے لگتی ہے
قبر کا مرحلہ ہو تو وہ چودھویں کا چاند بن کر تسکین دینے آتی ہے حشر کا میدان
ہو تو وہ شافع بن کر گناہوں کی پردہ پوش بن جاتی ہے۔ نزع میں اس
کی حیثیت مبشّر کی ہوتی ہے۔ عقل نہ مبشّر بن سکتی ہے نہ شافع۔ نہ تسکین
نہ سہارا۔ تسکین اور سہارا، بشارت اور تسکین، یہ سب محبت کے
مظاہر ہیں۔ محبت کے روپ ہیں، وہ ہر رنگ میں جلوہ گری کرتی ہے
اور نوازتی ہے۔

مشاہدۂ جمال

ہر قوی ذات کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اسے اپنی رضا کے تابع نہیں بنایا
جا سکتا۔ جہاں قوت، کام نہ دے، حیلے بہانے بیکار ثابت ہوں، وہاں اعتماد
جیتنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ اس کے سامنے اپنی بے بسی کا اعلان
کر دیا جائے۔ یہ اعترافِ شکست بسا اوقات انسان کے لیے غایت
درجہ مفید ثابت ہوتا ہے، یہی نہیں، کہ اعترافِ شکست کے ذریعے
انسان قوی ذات کی دستبرد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ بلکہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے

کہ حال کی شکستگی ہے کہ جب انسان قوی ذات کے سامنے جاتا ہے۔ تو اس کے جذبۂ رحم و کرم کو اس قدر تحریک ہو جاتی ہے کہ وہ نوازنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کبر و غرور کے ذریعے گدا کو سخی کی بارگاہ سے کچھ نہیں ملتا، بلکہ سرزنش کا مستحق قرار پاتا ہے۔ حال کی شکستگی جب سائل بنتی ہے، تو محروم نہیں رہتی۔ رحم آ جانے سے جو نوازش ہوتی ہے۔ وہ اس نوازش سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ جس کا محرک رحم و کرم کا جذبہ نہ ہو۔

ایک مزدور دن بھر مالک کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ اسے قاعدے اور قانون کے مطابق اجرت ملتی ہے۔ لیکن راہ چلتے کسی کریم ذات کی ایسے شکستہ حال انسان پہ نظر پڑ جائے۔ جس کی قوتِ گویائی بھی جواب دے گئی ہو، اور وہ سوال کے قابل بھی نہ ہو تو سخی کا جذبۂ رحم و کرم ابھر آتا ہے اور اسے اس قدر نواز دیا جاتا ہے۔ کہ برسوں کی محنت مزدوری پہ بھی وہ عطا بھاری ہوتی ہے حقیقی عطا وہی ہے، جو سخی کے دل سے موج بن کر ابھرے، اور گدا کو اپنی لپیٹ میں لے لے، ہاتھ کی عطا ناپ تول کی عطا کہلاتی ہے، یہ محدود ہوتی ہے، لیکن دل کی عطا کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ دل خود بے کراں ہے، اس کی عطا بھی بیکراں ہوتی ہے اور دل کی عطا کو دل ہی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ زبان سوال کرتی ہے تو اس میں عطا اور محرومی، دونوں کے امکانات موجود ہوتے

ہیں دل سائل بن کر صاحب دل کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو کبھی محروم نہیں رہتا۔ ظاہر کی عطا اہل ظاہر کے لیے ہوتی ہے اور دل کی عطا کے مستحق وہی لوگ قرار پاتے ہیں، جن کے پہلو میں شکستہ دل ہو۔

دل کی شکستگی ظاہر کی شکستگی پہ فوقیت رکھتی ہے، اسی لیے زیادہ عطا کی مورد بنتی ہے۔

قرآن نے جنت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہوگا۔ جس کی تمہارے نفوس آرزو کریں گے، اور جن چیزوں سے تمہاری آنکھیں لذت یاب ہوں گی۔ لیکن یہاں دل کا ذکر نہیں کیا گیا، نفس کے مطالبات پورے کرنے والی چیزوں اور آنکھوں کو فرحت بخشنے والی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد بات ختم کر دی گئی ہے۔ حالانکہ مملکتِ وجود میں دل کی بڑی اہمیت ہے، تو کیا ربانی کلام کا یہ مفہوم ہے، کہ اُخروی زندگی میں صرف نفوس اور آنکھیں ہی کامیاب ہوں گی؟ اور دل کو عطا و بخشش کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا؟ نہیں یہ بات نہیں، ربانی کلام کا مفہوم یہ ہے کہ نفوس اور آنکھوں کو ان کی پسندیدہ چیزیں عطا کر دی جائیں گی اور دل کو مشاہدۂ جمال نصیب ہوگا۔ جس کی جو طلب ہو گی اسے مل کر رہے گی۔ نفسِ راحت چاہتا ہے، اسے وہ ملے گی آنکھیں نظر فریب جلوؤں کی طالب ہیں اور وہ رعنائیاں انہیں دے دی جائیں گی۔

دل کا مطالبہ کچھ اور ہے، وہ ذات کا طالب ہے۔ وصالِ محبوب کے بغیر اسے چین نہیں آسکتا، اس کی شوریدگی ختم نہیں ہوسکتی۔ اور اس میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے اسے جمال کی دولت سے نوازا جائے گا۔

بات چوں کہ دل کی تھی، اس لیے راز بنی رہی۔ نفس اور آنکھوں کی طرح اس کی تشہیر نہیں کی گئی۔ گویا یہی کہا گیا ہے کہ تم نے ہماری لقا کے بھید کو ظاہر نہیں ہونے دیا، ہم بھی اسے ظاہر نہیں کریں گے پردے ہی پردے میں ملاقات ہوگی۔ تاکہ غیر نہ دیکھے، نہ سن سکے۔

محبّت کے جلوے

دو بچھڑے ہوؤں کی ملاقات عجیب و غریب کیفیات کی حامل ہوتی ہے بشرطیکہ دونوں میں روح کا رشتہ قائم ہو، روحانی رشتے کی استواری کے بعد فراق بھی مزا دیتا ہے اور وصال بھی رُوح کو گوناگوں لذتوں اور سرشاریوں سے آشنا کر دیتا ہے۔ بیگانے کا نہ ہی فراق کرب انگیز ہوتا ہے اور نہ ہی وصال کیفیتوں سے بہرہ ور کرتا ہے۔

مدتوں کے دو بچھڑے ملتے ہیں تو احساسِ جدائی آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکنے لگتا ہے، آنسوؤں کا ہر قطرہ جدائی کی کرب انگیز ساعتوں کا

غماز بن کر جاتا ہے۔ بسا اوقات زبان خاموش ہوتی ہے اور آنسو کیفیتوں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکنیں ماضی کے ان سانحات کو دہرانے لگتی ہیں۔ جن پر زبان و بیان کی تمام وسعتیں تنگ ہوتی ہیں۔ انہیں الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نوع کی کیفیتیں درد آشنا اور سکوں ناشناس دلوں میں پرورش پاتی ہیں، جب طوفان بن کر اٹھتی ہیں تو ان کا تحمل مشکل ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ سامنے والا دل بھی سکوں نا آشنا ہو، درد کی لذت سے واقف ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا تعلق اور ربط دو ایسے دلوں میں استوار ہو سکتا ہے جن میں ازلی مناسبت ہو، دونوں کے مابین سرمدی رشتہ محبت قائم ہو، ایسے دل بچھڑتے ہیں تو بلکتے ہیں، ملتے ہیں تو تڑپتے ہیں، یہ تڑپ اور یہ سوز آگینی محبت بھرے دلوں کی ازلی میراث ہے جو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا، نہ ہجر نہ ہی وصال نہ ہی حجاب اور نہ ہی بے حجابی، نہ ہی تغافل اور نہ ہی کرم، نہ ہی التفات اور نہ ہی بے التفاتی، التفات اور بے التفاتی، ستم اور کرم، جفا اور وفا، یہ تو سب محبت کے مظاہر ہیں۔ ستم بھی محبت کی ایک صورت کا نام ہے اور کرم بھی ایک ادا ہی تو ہے، اداؤں کو صرف لطف و کرم، الطاف و عنایات، نوازشات و اکرامات ہی میں محصور نہیں کیا جا سکتا، سمندر کی ہر موج حسین ہوتی ہے۔ صبح کا ہر جلوہ دلنواز کہلاتا

ہے، چمن کی ہر کلی میں علیحدہ بُو باس ہے۔ ایک کا اقرار اور ایک کا انکار خوئے محبت نہیں، یہ تو نری بوالہوسی ہے۔ محبت جب حدِ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو جفا و وفا، قہر و غضب، لطف و کرم کی حدود سے ماورا ہو جاتی ہے۔ دریا اسی وقت تک کے لیے کناروں کا پابند ہوتا ہے جب تک اس میں طوفان نہیں اٹھتے۔ طوفان اٹھتے ہیں تو کناروں کی حدود قائم نہیں رہتیں۔ بے کنارہ کی فطرت ہے کہ وہ بے کنار کر کے چھوڑتا ہے، کنارے ہوں تو محدود کہلاتا ہے۔ بے پایاں ہو جائے تو کناروں کا نام و نشان تک نہیں رہتا، محبت بھی دلِ یزداں سے نکلی ہوئی ایک تجلی کا نام ہے۔ یہ تجلّی جب انسان کے قلب پر پڑتی ہے تو اسے اپنی فطرت میں ڈھال لیتی ہے، نور ظلمت سے ہم آغوش ہونے کے بعد اسے اپنی طلعتیں عطا کرتا ہے۔ اپنی تابانیاں بخشتا ہے۔ طور صرف اسی وقت تک کے لیے طور تھا جب تک اس پر برقِ جمال نہ گری تھی، برق نے گر کر اپنے مزاج میں ڈھال لیا۔ خاکستر بنا دیا، تو وہ اربابِ بصیرت کی آنکھوں کا سرمہ بننے لگا۔ کلیمؑ کی ایک بیہوشی پر کتنے ہوش صدقے ہونے لگے۔ ایک درد بھرے دل نے کتنے دلوں کو تڑپ عطا کر دی۔ کتنے دلوں کو سوز کی کیفیتوں سے شناسا کر دیا! یہ شناسائی کیا تھی؟ برق تجلّی کا فیضانِ جمال، موسےٰؑ کی طلب کا پرتو، کلیمؑ

کے دل کی کیفیتوں کا اثر اور نتیجہ دائمی اثر صرف محبت چھوڑ سکتی ہے
برق محبت کسی وادی اور صحرا میں کوند کر ختم بھی ہو جائے تو اس کے
آثار و نقوش کو زمانے کی گردشیں اور لیل و نہار کے تغیرات نہیں مٹا
سکتے۔ فانی کا اثر فانی ہوتا ہے، اور باقی جو اثر چھوڑتا ہے، اسے ثبات و
دوام حاصل ہو جاتا ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم

مصوّر اندھے کو تصویر نہیں دکھاتا۔ تصویر وہیں دکھائی جاتی ہے جہاں
یقین ہو کہ بصارت موجود ہے اور ذوقِ سلیم کی بھی کمی نہیں، دیکھنے والا
فنی لطافتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اندھا سامنے ہو تو فن دکھانا
مشکل ہوتا ہے۔ صاحبِ نظر مل جائے تو دکھائے بغیر چین نہیں پڑتا
یہی وجہ ہے کہ قرآن کے اسرار اہلِ دل پر کھلتے ہیں معانی و مطالب کا
حسن انہی کو نظر آتا ہے۔

فن کار کا فن جب کمال کو پہنچ جاتا ہے، تو دل سے قیمت وصول
کرنے کی طلب مٹ جاتی ہے۔ اس وقت وہ داد چاہتا ہے۔ داد
مل جائے تو سمجھتا ہے کہ قیمت وصول ہو گئی۔ داد نہ ملے، تو قیمت پانے

کے بعد بھی ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی ذوق سیرابی صرف داد کر سکتی ہے اور اسی سے تسکین ملتی ہے
صحیح داد دینے والا مل جائے تو مصوّر یہ کہہ کر تصویر پیش کر دیتا ہے، اگر آپ
کو پسند ہے تو آپ کی نذر ہے۔ بسا اوقات جہاں لعل و جواہر کا کام نہیں
دیتے داد کام دے جاتی ہے مصوّر کے فن کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت
نہ ہو تو داد کا فن سیکھنا چاہیے۔ داد دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے
تو شاہکار جھولی میں آ کر رہتا ہے۔

یہ جو خدا تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک پر کثرت و تواتر سے درود
شریف پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے اور درود شریف کے بے شمار
فضائل بیان فرمائے ہیں، تو یہ کیوں؟ درود شریف دراصل نقاشِ
ازل کے اس فن کی داد ہے، جو جمالِ محمدی کی صورت میں ظاہر ہوا۔
شاہکارِ فطرت ظہور پذیر ہو کر سامنے آگیا تو حکم ہوا کہ اس پہ صلوٰۃ و
سلام بھیجو، یہی ہمارے فن کی داد ہے۔ داد کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔
بعض لوگ تصویر دیکھ کر نثار ہو جاتے ہیں۔ ان کے سینے کا سوز و درد
آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگتا ہے، زبان مصوّر کی عظمتوں کا اعتراف
کرنے لگتی ہے۔ یہ اعتراف ہی دراصل داد کی جان ہوتا ہے۔ جو مصوّر
کے احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ایسا داد دینے والا بھی مصوّر
کی نگاہ میں محبوب بن جاتا ہے۔ وہ اس کے افلاس کو نہیں دیکھتا۔ بیکسی

پر نظر نہیں پڑتی۔ یہی سمجھتا ہے کہ داد دینے والا مل گیا ہے تو، تصویر کا حسن و
جمال اس کا حق ہے۔ ایسے داد دینے والے کو کیسے محروم رکھوں؟ ہر عظیم
فن کار کی فطرت میں سخا ہوتی ہے، اور اس کے جذبات کو داد ہی کے
کے ذریعے متحرک کیا جا سکتا ہے۔ داد دی جائے تو جذبات میں تلاطم
پیدا ہو جاتا ہے۔ داد نہ دی جائے تو دل بجھ جاتا ہے کہ کس اناڑی کے
سامنے شاہکار پیش کر دیا؟ دست قدرت کے بے مثل و بے مثال شاہکار
سے اغماض ہی نے ابوجہل کو لعنتوں کا مستحق بنا دیا تھا۔ اور ابوبکر صدیق رض
کی صحیح داد ہی تھی، جس نے انہیں صدیق رض کے مرتبے پر فائز کر دیا۔

داد سے مرتبہ ہی نہیں ملتا، تصویر کا جمال بھی ملتا ہے، معرفت بھی حاصل
ہوتی ہے، اور سینہ لذت و کیفیات سے بھر جاتا ہے شاہکار سے منہ موڑنے
والوں کو نہ قرب ملتا ہے، نہ لذات و کیفیات۔ لذات و کیفیات تو صرف
تصویر دیکھ کر جان دینے والوں کا حصہ ہوتی ہیں۔

عظمت کے گیت

چمن کا حسن مالی کی تخلیقی صلاحیتوں کا غماز و آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر پھول کی دلکشی میں اسے اپنا ہی فنی حسن جلوہ گر نظر آتا ہے اس لیے پھولوں کی لطافتوں اور نزاکتوں سے اس کا غیر معمولی شغف دراصل اپنے ہی حسن سے غیر معمولی شغف کا نتیجہ ہوتا ہے' پھول آئینہ ہوتے ہیں اس کے اپنے حسن و جمال کا، وہ مظہر بن کر سامنے آتے ہیں تو اس کے نزدیک عزیز بن جاتے ہیں، اس کا دل لبھانے لگتے ہیں اور ان کا حسن اس کی مسرتوں میں اضافے کا موجب بن جاتا ہے۔ وہ انہیں ہر زاویے سے دیکھتا ہے۔ ان کی اداؤں اور دلفریبیوں کو اپنے فنی کمال کا مظہر جان کر ان سے پیار کرتا ہے۔

پھول خواہ کسی رنگ کے ہوں مالی کی عظمتوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں، ایک ایک سے اسے قلبی لگاؤ ہوتا ہے، ایک ایک کو وہ چاہتا ہے۔ اور ایک ایک کو عزیز جانتا ہے۔ ایک کا انکار بھی مالی کی عظمتوں کے انکار کے مترادف ہو گا۔ اس لیے کہ انہیں اس نے باغ کے حسن میں اضافے کے لیے پیدا کیا ہوتا ہے۔ ایک ایک کی شگفتگی اس کے دل کی

شگفتگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ حسن ایک ہی ہوتا ہے صرف رنگوں کا فرق ہوتا ہے، جو مختلف مظاہر میں ظاہر ہو کر دیدہ و دل کو تسکین بخشتا ہے۔ ایک پھول مالی کی پوری عظمتوں کو ظاہر نہیں کر سکتا، عظمتوں کے ظہور کے لیے حسن کا مختلف مظاہر میں ظاہر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح مالی کی عظمتیں آشکار ہوتی ہیں، اس کی فنی صلاحیتوں کو داد ملتی ہے۔ داد حاصل کرنے کے لیے اور اپنی عظمتوں کا لوہا منوانے کے لیے مالی کی عظمتوں کا حسن کثرت میں پھیل جاتا ہے کثرت داد خواہ بنتی ہے تو وحدت کو تسکین ملتی ہے۔ وحدت کو کثرت سے داد حاصل کرنے کے لیے کبھی کثرت میں پھیلنا پڑتا ہے، کثرت میں ظہور پذیر ہونا پڑتا ہے، کثرت کو حیران و ششدر کرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر وحدت کا دل سکون پذیر ہوتا ہے۔

انبیا علیہم السلام وحدت کے باغ کے وہ مختلف النوع پھول ہیں جن کا حسن و جمال مختلف رنگوں اور صورتوں میں ظاہر ہو کر نوع انسانی کے سامنے آیا اور ان سے داد وصول کی۔

پھولوں کی داد مالی کی فنی صلاحیتوں کی داد کہلاتی ہے اور ہر نبی کا کمال اپنے خالق و مالک، پروردگار اور آفرینندہ حسن و جمال کا کمال ہے، ان کی داد ان کے خالق و مالک کی داد ہے اور ان کی داد

ہے اور ان کی تکذیب ان کے خالق و مالک کی تکذیب کہلائے گی۔

مالی کبھی اپنے تخلیقی حسن کو کثرت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور کبھی چمن میں پھیلے ہوئے حسن کو وحدت کے لباس میں جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ تو اپنی آرزو کی تکمیل کے لیے باغ کے سارے پھولوں کو توڑ کر یک جا گلدستہ کی صورت میں جمع کر دیتا ہے۔ مختلف رنگوں اور صورتوں میں پھیلے ہوئے پھول جب گلدستے کی صورت میں ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ان کا حسن اور بھی دلآویز اور جاذبِ نظر بن کر روح پہ اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ پھول گلدستے میں آجاتے ہیں تو اور بھی حسین معلوم ہونے لگتے ہیں۔

خالقِ حسن وجمال نے اپنے تخلیقی حسن کو مختلف صورتوں میں دیکھنا چاہا تو وقتاً فوقتاً مختلف انبیاءؑ بھیج دیئے۔ کثرت کو وحدت کا رنگ دینا چاہا تو تمام انبیاءؑ کے حسن وجمال کو ذاتِ محمدیؐ میں جمع کر دیا۔ ایک ایک نبیؑ کی حیثیت ایک ایک پھول کی تھی اور ذاتِ محمدیؐ کی حیثیت گلدستے کی ہے۔ پھول جب جدا جدا ہوتے ہیں تو ایک ہی رنگ اور ایک ہی شان کے مالک کہلاتے ہیں، گلدستے میں آنے کے بعد ان کی شان کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ دور بھی نہیں رہتے، قریب آجاتے ہیں۔ کیونکہ گلدستہ قریب ہوتا ہے اور ان کے حسن وجمال کی شان بھی فزوں ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایک نبی کا انکار تمام انبیاءؑ کے انکار

کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ ایک پھول کا انکار گلدستے کے انکار کے مترادف ہوتا ہے۔ گلدستہ چونکہ مختلف پھولوں سے بنتا ہے اس لیے ہر پھول کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مختلف پھولوں کی عظمت ہی سے گلدستے کی عظمت بنتی ہے۔ گلدستہ تمام پھولوں کی عظمتوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوتا ہے ان کی بہار دکھاتا ہے ان کی عظمتوں کو آشکار کرتا ہے اور ان کی عظمتیں اس کی اپنی عظمتیں کہلاتی ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے ہر نبیؑ کی عظمت کے تحفظ و بقا کے لیے پوری پوری کوشش کی ہے۔ اور ہر نبی نے حضورؐ کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔

ذات و صفات

قدیم ایام سے عرب میں یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ شاعر اپنا تازہ کلام خانہ کعبہ کی دیواروں سے لٹکا دیتے تھے۔ یہی ان کے تعارف کا ذریعہ بنتا تھا۔ اور اسی کے ذریعہ ان کی فنی عظمتیں آشکار ہوتی تھیں۔ تا آنکہ ایک دن ان کی آنکھوں نے ایک ایسے کلام کو دیکھا جو ان کے دلوں میں اتر گیا۔ جو اپنے اسلوبِ بیان، تاثیر اور معانی و مطالب کے اعتبار سے اس کلام سے یکسر مختلف تھا جسے عرب شعرا اپنے لیے

سرمایۂ نازش و افتخار جانتے تھے۔

چند ربانی آیات کو ایک خوش ذوق نے وہیں لاکر لٹکا دیا جہاں شعرائے عرب کا کلام آویزاں تھا۔ ابوجہل کی نظر پڑی تو وہ چیخ اٹھا کہ یہ بشر کا کلام نہیں "

ابوجہل ہی کا یہ احساس نہ تھا، ہر صاحب طرز اور خود کو وحید العصر جاننے والے شاعر کا یہی احساس تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ جان کر وہ پریشان ہو گئے۔ اور ان کا سارا کیف و سرور ختم ہو گیا کہ یہ وہی کلام ہے جو عبداللہ کے بیٹے اور عبدالمطلب کے پوتے پر نازل ہوا ہے۔

کبیدگی بعد میں پیدا ہوئی۔ پہلا تاثر یہ نہ تھا۔ پہلے تو وہ اس کی غایت درجہ مدح وستائش کر رہے تھے۔ غرض کسی ذات کی معرفت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک ذات کی لگن اور ایک صفات کی معرفت۔ صفات کی معرفت بھی ذات کی معرفت عطا کرتی ہے اور انسان کسی ذات کی صفات سے آگاہ ہونے کے بعد اس کا گرویدہ بن جاتا ہے۔

لیکن ذات سے غیر معمولی لگاؤ کے باعث جو رشتہ قائم ہوتا ہے وہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اور صفات کے ذریعے قائم ہونے والے رشتے میں یہ یکنگی اور پائیداری نہیں ہوتی، کیونکہ صفات بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ذات نہیں بدلتی۔

صحابہؓ کو حضورؐ کی ذات سے محبت تھی۔ اور یہی محبت
انہیں عرفانِ رسولؐ عطا کر رہی تھی، قرآن تو تدریجاً نازل
ہوا ہے اور اس کی تکمیل وصالِ نبوت کے قریب ہوئی ہے
صحابہؓ اس وقت بھی عشق کے اعلےٰ ترین مقام پہ فائز تھے
جب قرآن کی چند آیات نازل ہوئی تھیں، عشق کی تکمیل
صحابہؓ کی اس محبت نے کی، جو انہیں حضورؐ کی ذات سے
تھی۔ صدیقؓ چہرہ دیکھ کر فدا ہو گئے۔ فدائیت کے لیے
انہیں کسی دلیل کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ وہ ذات
پہ فدا تھے۔

ذات کے شیدائی اور صفات کے شیدائی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ
صفات کے شیدائی کی ساری سرگرمی اسی وقت تک کے لیے ہوتی ہے
جب تک محبوب کی ذات میں وہ صفت موجود رہے جو کشش کا موجب
ہو وہ صفت زائل ہو جائے یا اس میں ذرا سا تغیر آ جائے، تو عشق کی
ساری سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ذات کے فدائی کا ولولہ کبھی سرد نہیں
پڑتا۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں وہ کرم کا مورد بنے یا ستم کا، اس پر
لطف و عنایات کی بارش ہو یا تغافل برتا جائے، وہ تو تغافل کو بھی کرم
سمجھ کر نثار ہونے لگتا ہے۔ جس کی وابستگی کا باعث صرف وہ ادائیں ہوں

جو اسے پسند ہوں وہ ان کے خلاف دیکھتا ہے۔ تو اسے دھچکا لگتا ہے۔ اور وہ محبت کی ساری بساط سمیٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ذات کا عشق ایسی تمام خامیوں سے پاک ہوتا ہے۔ ذات مقصودِ حیات نہیں بنتی تو صفات کی گرویدگی کو ثبات و دوام حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ عیش و آرام میں خدا کی رحیمی اور کریمی کے گن گانے والے بسا اوقات مصائب میں ملحد ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے پیشِ نظر ذات نہیں، صفات ہوتی ہیں صفات میں تغیّر دیکھتے ہیں تو بدل جاتے ہیں۔

نعمت اور منعم

اہلِ دنیا کے نزدیک غنا کا یہ مفہوم ہے کہ انسان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو، اس کی حیات عیش و نشاط سے عبارت ہو۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ مال کن ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے، اس کے حصول کے ذرائع جائز تھے یا یہ ضمیر فروشی اور اصول شکنی کا نتیجہ ہے، لیکن اہلِ آخرت کے نزدیک غنا کا یہ مفہوم نہیں۔ دنیا کا تمام زر ساز و سامان موجود ہونے کے باوجود اگر دل دولتِ ایمان سے خالی ہو تو وہ ایسے انسان کو مفلس جانتے ہیں۔

غنا کا تعلق مال و دولت کی فراوانی سے نہیں یہ خالصتاً ذوقی و وجدانی چیز ہے۔ روئے زمین کے خزانے موجود ہونیکے باوجود اگر انسان اپنے منعمِ حقیقی کی رضا حاصل نہ کر سکے تو وہ غنی نہیں کہلا سکتا۔ غنا کا تعلق منعمِ حقیقی کے لطف و کرم سے ہے۔ کچھ نہ ہونے کے باوصف اگر منعم کی رضا حاصل ہو تو انسان غنی ہوتا ہے اور اگر منعمِ حقیقی کے کرم سے محروم ہو تو دولت کی فراوانی بھی اسے غنی نہیں بنا سکتی۔ بعض لوگ کچھ نہ ہونے کے باوجود غنی ہوتے ہیں۔ اور بعض کو مال و دولت کی فراوانی بھی احتیاج سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ان کے پاس منعمِ حقیقی کی رضا کی دولت نہیں ہوتی۔ قارون اپنے تمام تر خزانوں کے باوجود مفلس تھا اور بلال حبشیؓ اور ابوذر غفاریؓ کچھ نہ ہونے کے باوجود غنی تھے

بندے پر جب خداتعالیٰ کا خصوصی کرم ہوتا ہے تو اس کے دل میں رضا کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ وہ مال و دولت کو چنداں قابلِ التفات نہیں سمجھتا اور اس کے ہونے یا نہ ہونے سے اس کی طلب میں کوئی کمی پیدا نہیں ہو سکتی۔ رضا کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو دوسری تمام چیزوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ رضا کا طالب صرف رضا کا طالب ہوتا ہے اور اس کے دل میں کوئی دوسری طلب راہ نہیں پا سکتی۔ دوسری طلب اگر بے چین کرنے لگے، رضا کی منزل کے حسن کو

نگاہوں سے اوجھل کر دے خواہ وہ ایک لمحہ کے لیے ہی کیوں نہ ہو تو یہ طلب خام ہوگی۔ طلب جب صدیق بن جاتی ہے تو اس کا محور و مرکز صرف رضا قرار پاتی ہے۔ مال و دولت کی کمی پہ نظر نہیں ہوتی۔ بلال حبشیؓ اور ابوذر غفاریؓ کی صورت میں وہ تہی دامن بھی ہوتی ہے، دامن تار تار بھی ہوتا ہے۔ اور پیوند آلود قبا میں ملبوس ہوتی ہے۔ تو پھر بھی اس کی سرمستیوں کو ہفت اقلیم کے سلطان کا مال و دولت سے حاصل کیا ہوا نشہ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ تہی دامنی میں مست و سرشار صرف منعم کی رضا کا طالب ہی رہ سکتا ہے، جو منعم کو نعمت کی کمی بیشی کے باعث پہچانتا ہے۔ وہ اسی کو تعلق کا معیار جان کر رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ فائزِ منزل نہیں ہو سکتا۔ فوز و فلاح صرف طالبِ رضا کا حصہ ہے اور یہ انہی کو حاصل ہوتی ہے جو نعمت کو معیارِ تعلق بنانے کی بجائے منعم کی رضا کو معیارِ تعلق جانتے ہیں منعم کی رضا کے طالب کے تعلق کو ثبات و دوام حاصل ہوتا ہے اور نعمت کے بجویا کبھی ایک حال پہ قائم نہیں رہ سکتے نعمت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے خلوص کے دعوے بھی بڑھنے لگتے ہیں۔ نعمت کم ہو جائے تو خلوص کے دعووں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور اگر درمیان سے نعمت کا قضیہ اٹھ جائے تو ان کے تعلق کے سارے قصرِ ایمان منہدم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ منعم کی رضا کے بندوں کے ساتھ یہ صورت پیش نہیں

آسکتی۔ رضا کے بندے ہر حال میں رضا کے بندے رہتے ہیں۔ پھولوں سے دامن بھر جائے تو ان کی نسبت میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا اور دامن کانٹوں میں الجھ کر تار تار ہو جائے تو ان کی نسبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ نعمت کے طلب گار کی نظر سے منعم کی رضا کا حسن و جمال پوشیدہ ہوتا ہے اور منعم کی رضا کے طالب نعمت کو مقصد حیات نہیں بناتے۔ دونوں کی منزل جدا ہے اور دونوں کا اندازِ نظر بھی مختلف ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں اور ایک، دوسرے کی واردات و کیفیات کو نہیں سمجھ سکتا۔

مشاہدے کی لذتیں

یہ کائنات، جو مختلف شیون و مظاہر کی صورت میں نظر آرہی ہے قدرت کے ایک سربستہ راز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہر ایک چیز کی خاصیت، رنگ اور مزاج جدا ہے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی مناسبت نہیں ایک ہی جنس کے افراد میں بسا اوقات اس قدر تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایک کا دوسرے سے نہ مزاج ملتا ہے نہ رجحانات و میلانات میں کوئی مناسبت نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ غذا اور لباس کے سلسلے میں

بھی اندازِ فکر جداگانہ ہوتا ہے۔ ایک کو ایک چیز مرغوب ہوتی ہے اور
دوسرے کے لیے وہی قابلِ نفرت قرار پاتی ہے۔ ایک کی جاذبیت
دکشش کو ایک انسان منتہائے مقصود قرار دے کر اس کے حصول کی تگ و
دو میں تمام راحتیں قربان کر دیتا ہے اور دوسرا اسے قطعی طور پہ ناقابلِ
التفات سمجھ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ جس چیز سے فطری طور پر نفرت
ہو، اسے دلائل و براہین کے ذریعے مقبول و محبوب نہیں بنایا جا سکتا اور
جس میں دل اٹکا ہو، وہ دلائل کے ذریعے معیوب نہیں بن سکتی۔ اپنی فطری طلب
ہی ہوتی ہے جو کسی چیز کو محبوب بناتی ہے چاندنی رات میں چکور کا رقص
کسی دلیل کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اپنی قلبی کیفیت کو وہ چاندنی کے آئینے میں دیکھتا
ہے۔ تو چاندنی اور زیادہ حسین و دل فریب اور کیفیت افزا نظر آنے لگتی
ہے اور وہ رقص کرنے لگتا ہے۔ رقصاں اور جولاں دراصل چکور کی اپنی ہی
…ی کیفیت ہوتی ہے چاندنی کی حیثیت تو محض آئینے کی ہوتی ہے۔
…ر کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب وہ آئینے میں اپنا حسن و جمال دیکھتا
حسن تو اس پہ اک نئی بہار آ جاتی ہے، دل نئی لذتوں اور کیفیتوں
سے سرمست و سرشار ہو جاتا ہے۔ حبشی کو آئینہ دیکھ کر وہ لذت حاصل نہیں
ہو سکتی جو حسن جہاں فروز کا حصہ ہوتی ہے۔ آئینے سے اس کا تکدر اس کی
اپنی فطرت کا غماز ہوتا ہے۔

دلیل حبشی کو آئینے کا گرویدہ نہیں بنا سکتی۔ صورت دل فریب پائی
ہو تو آئینے کے قصائد پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ادھر آئینہ سامنے
آیا اور ادھر دل مچلنے لگا جمال بینی کی لذت خود بخود فزوں ہونے لگتی ہے
پہروں آئینہ دیکھنے کے باوجود بھی ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی۔ اس کی حسن
خواہش ہوتی ہے کہ یہ تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ حبشی کے دل میں یہ جذبہ پیدا
نہیں ہو سکتا۔

عبادت وقبولیت بھی قدرت کے مصفّٰے اور مجلّٰے آئینے ہیں۔ سعید
فطرت انسان ان میں اپنی فطرت کا حسن دیکھتا ہے تو اس کا ذوق سیراب
نہیں ہوتا۔ پہروں عبادت میں رہ کر ذوق کی سیرابی چاہتا ہے۔ منافق کے
کے لیے عبادت میں چند لمحے گذارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی فطرت کا کھوٹ
کھل کر سامنے آجاتا ہے، جو اسے عبادت کے آئینے کے سامنے ٹکنے نہیں دیتا۔

کافر اور منافق کی زندگی کا تمام تر انحصار دلیل
دبرہان پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی سکون سے
محروم کر دیتی ہے۔ عقل کا پجاری دلیل چاہتا ہے اور دلیل
انتشار پیدا کرتی ہے محبت دلیل نہیں چاہتی، وہ اشتعال
مانگتی ہے۔ محبوب کا ذکر سن کر ہی وہ مشتعل ہو سکتی ہے، دلیل
سے اس میں اشتعال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصود چونکہ صرف

محبوب کی ذات ہوتی ہے اس لیے اس میں وحدت ہوتی ہے اور عقل کا مقصود چونکہ واحد نہیں ہوتا اس لیے قدم قدم پہ انتشار کا شکار ہوتی ہے۔

عقل اشتعال کی خواہاں نہیں اور محبت کو دلیل کی ضرورت پیش نہیں آتی ایک کے مقدر میں انتشار کی بے کیفیاں ہیں اور ایک کے نصیب میں مشاہدے کی لذتیں مقصود کے جدا ہونے سے نتائج بھی جدا گانہ مرتب ہوتے ہیں۔

محبّت کے معجزات

حیات انسانی کا مقصود ظاہری آرائش و زیبائش ہی نہیں، باطن کی تطہیر انسان کا اصلی جوہر ہے دل پاک ہو تو ظاہری آرائش کے بغیر بھی انسان زندگی کے اس مقصود کو حاصل کر سکتا ہے جس کے لیے اس کی تخلیق کی گئی ہے۔ صرف ظاہری آرائش ہی مقصود کو پالینے کا ذریعہ نہیں بن سکتی طبیب حاذق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مفہوم کو کتنے بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جسے دل کہا جاتا ہے۔ گوشت کا یہ لوتھڑا صحیح ہو جائے تو انسان کا

جسم تندرست ہو جاتا ہے۔ اس لوتھڑے کی صحت کے بغیر جسم کی صحت ممکن نہیں۔

حضورؐ کی بعثت کا مقصود صرف پند و موعظت ہی نہ تھا۔ حضورؐ تزکیۂ نفس بھی فرماتے تھے۔ نگاہ نبوّت معصیت سے آلودہ دلوں کو پاک صاف کر دیتی تھی۔ آفتاب کے سامنے آجانے کے بعد ظلمتوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ آفتاب کی تجلّیاں ظلمتوں کو نور سے بدل دیتی ہیں۔ جہاں ظلمتوں کا تسلط ہو نور کی تابانیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ آفتابِ نبوت کے سامنے آجانے سے بھی دل کی کدورتیں دھل جاتی تھیں۔ کفر و شرک کی تیرگیاں مٹ جاتی تھیں۔ یہ فیضانِ نبوّت ہی تو تھا جو صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ و علیؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ اور صہیب رومیؓ کو بارگاہِ نبوت میں کھینچ لایا۔ متحرک میں کھینچنے کی صلاحیت موجود ہو تو محرک کی کرشمہ نمائیاں دیدنی ہوتی ہیں۔ پروانے کی طلب شمع کے وجود کا خود ہی احساس دلا دیتی ہے۔ سوز سے محروم پتنگوں کے لیے نہ شمع کی ضیاء دیدنی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا جمال انہیں کھینچ سکتا ہے۔ کھینچتی ہے تو وہ بھی محبت کی مستی اور کھینچتی ہے تو وہ بھی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی۔ طلب رہنما بن کر سامنے آتی ہے تو منزل رسیدہ بنائے بغیر نہیں چھوڑتی۔ طلب کے بغیر محبت کی راہ میں دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ہوس ہمیشہ

آرام چاہتی ہے وہ سکون کی طالب ہے۔ اغراض پسندی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ محبت کے دل میں اپنے سے زیادہ محبوب کی طلب کا احترام ہوتا ہے، وہ اغراض سے پاک ہوتی ہے، ہوس سے اس کا دامن آلودہ نہیں ہوتا۔ آلودگیاں تو ہوس کا حصہ ہیں۔ ہوس کا مقدر ہیں وہ ان سے نہیں نکل سکتی۔ محبت کی بارگاہ کے دروازے اس پہ کب کھل سکتے ہیں۔ کشادگی محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ محبت خود کشادہ ہے، وہ ناہموار راستوں کو ہموار کر دیتی ہے۔ تلخیوں کو شیرینی میں بدل دیتی ہے تنگیوں میں بے کراں وسعتیں پیدا کر دیتی ہے جہاں کسی چیز کی گنجائش نہیں ہوتی وہاں محبت کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔ جن رفعتوں تک کوئی نہیں پہنچ سکا وہاں محبت پہنچی ہے اس نے ان حجابات کو اٹھایا ہے جو ازل سے پڑے تھے اس نے ان جلووں کو بے نقاب کیا ہے جو ہمیشہ سے حجاب میں تھے۔ ہوس پہ نہ کبھی ناکشودہ دروازے کھلے ہیں نہ ہی اسے باریابی حاصل ہوئی ہے۔ باریاب ازل سے محبت ہے فائز المرامی اس کا حصہ ہے۔ جس راہ پہ ہوس کا کارواں نہیں گزر سکتا۔ محبت بے کھٹکے گزر جاتی ہے۔ جن مفاہیم کو ہوس نہیں سمجھ سکتی محبت نے ہمیشہ ان کی وضاحت کی ہے۔ انہیں بیان کیا ہے اور ان کی لذتوں سے قلوب میں سرشاری بھر دی ہے، دلوں کو مستیاں عطا کی ہیں۔ ذوق،

وجدان کو مست کیا ہے۔ مستیاں اور سرشاریاں محبت کا فیضان ہوتی ہیں یہ کیفیتیں محبت عطا کرتی ہے۔ محبت خود مست ہے وہ مستی بانٹتی ہے۔ ہوس نہ خود مست ہے اور نہ مست کر سکتی ہے۔ اس کے پلّے میں بے کیفی کے سوا کیا ہے یہ مستی اس نے نہ ازل میں چکھی تھی نہ ابد میں چکھے گی۔ جن روحوں نے ازل میں محبت کی مستی کا مزہ چکھا تھا۔ وہ عالمِ آب و گِل میں آنے کے بعد بھی اس سے محروم نہیں۔ ہوس عطیہ دینے کے بعد چھین لیتی ہے یا وہ خود بخود چھن جاتا ہے۔ محبت عطا کرنے کے بعد نہ خود چھینتی ہے نہ اس کے عطیے کو کوئی چھین سکتا ہے۔ وہ خود باقی ہے اس کے عطیات بھی باقی رہتے ہیں۔ زوال نہ محبت کو ہے نہ اس کے عطیات کو۔ بقاء کی منزلوں کا مسافر ہی بقاء کی حقیقتوں سے آشنا کر سکتا ہے۔ فانی منزل کا مسافر خود فانی ہوتا ہے اور اس کے عطیات بھی فانی ہوتے ہیں۔ زمانے کی تغیر پذیر رفتار کے ساتھ وہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے۔ انقلاب کی ایک ٹھوکر ان کی آب و تاب ختم کر دیتی ہے۔ محبت کے عطیے انقلابات کی زد میں آتے ہیں تو ان میں اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا حسن نکھرتا ہے۔ ان کی رعنائیوں میں اور دلآویزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ محبت کی دلآویزی براہ راست روح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دل و دماغ پر شب خون مارتی ہے اور رگ رگ میں نشہ بن کر سما جاتی ہے۔ روح اور روح

کی ساری جلوتیں اس کی جلوہ گاہ ہیں۔ جسم انسانی کا ریشہ ریشہ اس کی منزل ہے یہاں محبت ہی جلوہ گر ہو سکتی ہے اور اپنے معجزات دکھا سکتی ہے۔ ہوس کی یہاں رسائی ممکن نہیں۔

پرتو حسنت نہ گنجد در زمین و آسماں
در میانِ سینہ حیرانم کہ چوں جا کردہ ای

قلبِ سلیم

انسان کو قدرت نے سننے، دیکھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں بخشی ہیں۔ ان میں سے ایک قوت بھی موجود نہ ہو، تو دوسری قوتوں کے ذریعے اس کی تلافی نہیں کی جا سکتی۔ آنکھ کا کام دیکھنا ہے۔ یہی اگر نور سے محروم ہو جائے تو سماعت کے ذریعے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ عقل کی جنس خواہ کتنی بھی وافر تعداد میں موجود کیوں نہ ہو، سماعت سے محروم ہونے کے بعد انسان عقل کے ذریعے سن نہیں سکتا۔ ہر جنس کا الگ وظیفہ حیات ہے اور دوسرے حواس کو اس کی مملکت میں دخل اندازی کی اجازت نہیں۔

قدرت کا یہی قانون باطنی دنیا میں بھی کار فرما ہے۔ باطنی حواس اگر بیکار و معطل ہو جائیں، تو ظاہری حواس اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔ روح و قلب

جو عطیۂ ربانی کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے ذمے بھی بہت کام ہیں۔ عقل اپنی تمام تر طرفہ کاریوں کے باوجود روح و قلب کا وظیفہ سرانجام نہیں دے سکتی اور نہ دوسرے حواس اس میں کام آ سکتے ہیں۔ سر کے ذمے الگ خدمت ہے اور پاؤں کے ذمے الگ نہ پاؤں سر کا کام دے سکتے ہیں۔ اور نہ سر کے ذریعے ہاتھ کا کام لیا جا سکتا ہے، جو جس خدمت پر مامور ہے، وہی کام دے گا۔

ہدایت ربانی کا تعلق انسان کے ظاہری حواس سے نہیں، بلکہ دل سے ہے۔ عقل کی حیثیت تو محض ایک آلہ کی ہے، وہ جو پیام سنتی ہے، اسے خواہ وہ حق ہو یا باطل، دل کے کانوں تک پہنچا دیتی ہے، قبول کرنا یا رد کر دینا دل کا کام ہوتا ہے دربان کا کام تو یہی ہوتا ہے کہ وہ شاہ کی بارگاہ میں آنیوالوں کی اطلاع دیدے۔ باریابی عطا کرنا یا رد کر دینا شاہ کا کام ہوتا ہے، دربان کو یہ قدرت حاصل نہیں۔ عقل بھی نہ رد کر سکتی ہے نہ قبول کر سکتی ہے۔ رد و قبول کا فتویٰ مملکتِ وجود میں فرمانروائی کرنے والے بادشاہ دل کے سپرد ہے۔ دل میں سلامتی موجود ہو تو وہ کسی رد و قدح کے بغیر ہدایت قبول کر لیتا ہے۔ سلامتی سے محروم دل کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ ربانی ارشاد کے مطابق رضوان کی منزل اس انسان کو حاصل ہو گی جو اپنے مولا کی بارگاہ میں قلبِ سلیم لے کر حاضر ہو گا۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ جو

انسان عقل ۔۔۔۔ کی بوالعجبیوں اور حیرت زائیوں کا پشتارہ اٹھا کر پہنچے گا،
وہ نوازا جائے گا۔ نوازش اور کرم کو صرف قلبِ سلیم لے کر حاضر ہونے
والوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ایک ذہین و فطین انسان جو غائت
درجہ عقل مند ہو لیکن اس کا دل گندہ ہو، دنیا کی کسی بارگاہ میں نہیں ٹک
سکتا۔ ایسے ذہین کو نکال دیا جاتا ہے اور بھولا بھالا پاک دل انسان
بسا اوقات مقرّب بن جاتا ہے۔ قرب دل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے
عقل کے ذریعے صحبت نصیب ہو بھی جائے تو اسے قرب نہیں کہا جا سکتا
کیونکہ عقل پاس رہ کر بھی دل کا راز نہیں پا سکتی اور دل دور رہ کر بھی محبوب
کے دل کے بھیدوں سے واقف ہوتا ہے۔ ادھر دل دھڑکتا ہے اور ادھر
برسوں کی مسافت پر ہونے کے باوجود محبوب کے دل کی دھڑکنوں کو
اپنے دل میں محسوس کیا جاتا ہے۔ عقل قریب رہ کر بھی دور رہتی ہے
اور محبت بھرا دل دور رہ کر بھی حضوری کے مزے لوٹتا ہے

قرآن کا نزول عقل پر نہیں دل پہ ہوا ہے، یہ یار کا بھید ہے، یار
کی امانت ہے، اس لیے دل کے سپرد کی گئی ہے۔ اب بھی یہ دولت اہلِ
دل کو ملتی ہے۔ اہلِ عقل پہ تو اس کے حقائق و معارف نہیں کھل سکتے۔ دل
کی امانت عقل کے پاس کیسے پہنچ سکتی ہے؟

ازل میں بھی محبت کا امین دل تھا اور ابد تک یہ امانت اسی

کے پاس رہے گی۔ یہ ایسا خزانہ نہیں جسے عقل کے راہزن لوٹ سکیں۔ وفادار امین جان دے دیتے ہیں لیکن راز نہیں دیتے۔ وفاداری دل کی سرشت ہے عقل کی نہیں۔ عقل کے آبگینے تو ایک ہی ٹھوکر سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اور وہ راز اگلنے لگتی ہے۔ دل کو چیر کر نیزے کی انی پہ بھی رکھ دیا جائے تو وہ صدیق رہتا ہے، امین رہتا ہے۔ عقل کا رشتہ قائم ہونے کے بعد ٹوٹ جاتا ہے اور دل کا رشتہ قائم ہونے کے بعد کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اسی لیے قلبِ سلیم کی بڑی اہمیت ہے۔

زندگی کی راہ

کافر کی زندگی کی تمام ترنگ و تاز دنیوی زندگی کے لیے ہوتی ہے۔ اخروی زندگی کا چونکہ کوئی واضح تصوّر اس کے سامنے نہیں ہوتا اس لیے اس کے دل میں آخرت کے لیے کوئی امنگ پیدا نہیں ہوتی۔ اپنا سب کچھ وہ دنیوی زندگی ہی کو سمجھتا ہے اور اسی کے لیے مرتے دم تک کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ مومن دنیا کو آخرت کی کھیتی جانتا ہے۔ اس لیے دنیوی کاروبار میں مصروف بھی رہتا ہے تو اس کی نظر آخرت کو سدھارنے پر مرکوز رہتی ہے۔ آخرت مومن کے نزدیک دنیا کا

ثمر ہے یہاں اپنے فرائضِ حیات سرانجام دیتے وقت اس کا دل اس احساس سے لبریز رہتا ہے کہ مجھے ایک دن ان کا جواب دہ ہونا ہے۔ جو وظائفِ حیات میں یہاں سرانجام دوں گا، اس کا مآل اُخروی زندگی میں میرے سامنے آکر رہے گا۔

کسان کو اپنی زندگی میں ایک ہی موسم سے نہیں گزرنا پڑتا۔ مختلف موسموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سردی اور گرمی کے کئی ادوار اس پہ گذرتے ہیں۔ کبھی سردی کی ہولناکی اس کے عزم کا امتحان لیتی ہے اور کبھی اسے گرم لُو برداشت کرنا پڑتی ہے۔ برق و باراں کے مختلف مناظر بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ اس کی زندگی میں کئی ایسے مواقع آتے ہیں جب دل و دماغ پہ خوفناک کیفیتیں طاری ہو جاتی ہیں۔ اپنی محنت کا ثمر اسے رائیگاں ہوتا ہوا نظر آنے لگتا ہے اور اس کے دل کی دھڑکنیں دعا بن کر قاضی الحاجات کو پکارنے لگتی ہیں۔ غرض کسان کی زندگی ایک پیہم کش مکش، جدوجہد اور امید و بیم کی زندگی ہوتی ہے۔ قدرت نے اسے جو ثبات آشنا دل بخشا ہوتا ہے، وہ مایوسیوں میں بھی اسے ناامید نہیں ہونے دیتا اور طوفانوں میں گھر کر بھی اس کی جدوجہد کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس کی نظر خدا تعالیٰ کی بے پناہ رحمتوں پہ مرکوز رہتی ہے۔ تب کہیں جاکر اسے اپنی محنت کا ثمر خرمن کی صورت میں نظر آتا ہے۔

حضور علیہ السلام نے دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا ہے۔ اس کھیتی میں کام کرنے والوں کو بھی مختلف حالات پیش آتے ہیں۔ جہاں جذبات سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور زندگی کے مطلع پر امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی، چاروں طرف کڑکتی بجلیاں خرمنِ حیات کو جلا کر خاکستر کر دینے کے لیے کوندتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ طوفان کی شورشوں میں نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی اور لگا ہوں کے سامنے ایسا مہیب اندھیرا دکھائی دینے لگتا ہے جس میں دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں نظر اس قادر و قیوم پر رہتی ہے جو نیست کو ہست اور ہست کو نیست کر دینے کی قدرت رکھتا ہے، تو مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں، تاریکیاں نور میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور ظلمتیں لو دینے لگتی ہیں۔ کسان حالات کی ناسازگاری کے باعث دل برداشتہ ہو کر بیٹھ جائے اور اپنی جدوجہد کا سلسلہ منقطع کر دے، تو رحمتِ باری اس کی معاون و مددگار نہیں ہو سکتی۔ رحمتِ باری اسی انسان کی معاون و مددگار بنتی ہے، جو طوفان میں بھی اسے پکارتا ہے۔ حالات کی ناسازگاری میں بھی اس کی نظر خدا کے لطف و کرم پر رہتی ہے۔ جہاں تمام وسائل منقطع ہو جائیں وہاں وہ اسی ذات کو اپنا مشکل کشا سمجھ کر پکارنے لگتا ہے، جو ہر حال میں مشکل کشائی کی قدرت رکھتی ہے۔

کافر کی نظر نہایت محدود ہوتی ہے۔ وہ وسائل کے پس پردہ کارفرما قوت کی اہمیت کا اندازہ لگانے سے قاصر رہتا ہے۔ وسائل موجود ہوں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ وسائل میں کوئی کمی آجائے تو اس کی امیدوں کے تمام چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ اس کی گھبراہٹ دیدنی ہوتی ہے۔ مومن کی یہ شان نہیں، وہ وسائل کی موجودگی میں بھی کارسازِ حقیقی کو پکارتا ہے اور وسائل کے معدوم ہونے کے بعد بھی اس کی نظر خدا کی قدرتِ کاملہ پر رہتی ہے۔ ایک کی نظر میں وسائل کارساز ہیں اور ایک کی نگاہ میں وسیلہ، وسیلہ نہ ہونے کے باعث بھی وہ خدا تعالیٰ ہی کو کارساز سمجھتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی نصرت و اعانت انہی لوگوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے جو اسے کارسازِ حقیقی سمجھتے ہیں۔ وسائل کی موجودگی میں وہ خدا تعالیٰ کی ذات سے بے نیاز نہیں ہوتے اور وسائل کے نہ ہونے کے باعث یہ خطرہ ان کے قریب نہیں پھٹک سکتا کہ اب خدا تعالیٰ کی نصرتوں کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ہر حال میں اسی سے لو لگائے رہتے ہیں اور یہی لو ان کی زندگی کی راہوں میں بدرِ منیر بن کر چمکتی ہے۔ زندگی کی راہیں ان پر کشادہ کر دیتی ہے اور منزلیں سمٹ کر ان کے قدموں میں آجاتی ہیں۔

قدرت کی تقسیم

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی من حیثیت القوم حق کا ساتھ دیا ہے، خدا تعالیٰ کی تائید ان کے شامل حال رہی ہے، ہر جگہ اور ہر مقام پر ان کی کامیابیوں کے لیے نئی نئی راہیں کھلی ہیں۔ زمانہ ان کے مزاج کے مطابق ہو گیا، انہوں نے جو ارادہ کیا وہ پورا ہوا جس دروازے پہ دستک دی وہ کھلا جس محاذ پہ قدم رکھا اسے سر کر کے چھوڑا کوئی مشکل ان کے سامنے مشکل نہ رہی، دریا پہاڑ اور صحرا ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔ ابتلا اور امتحان کا دور اسی وقت شروع ہوا جب انہوں نے اسلامی اصولوں کو نظر انداز کر دیا۔ وہ راہ اختیار کی جو ضلالت کی کی راہ تھی۔ ربانی ہدایات کو نظر انداز کرنے کے بعد نہ ہی ان کی اکثریت انہیں عبرتناک ہزیمتوں سے بچا سکی۔ اور نہ ہی جنگی ساز و سامان کی فراوانی ان کے اخلاقی انحطاط کا مداوا بن سکی۔

مسلمانوں کے عروج و اقبال کا دور اسی وقت تک رہا ہے جب زندگی کی شاہراہوں میں ربانی ہدایت ان کے لیے مشعل راہ کا کام دے

رہی تھی۔ فوز و فلاح ان کے نزدیک ان راحتوں سے زیادہ عزیز تھی جو انہیں غلط راہ پر چل کر حاصل ہو سکتی تھیں۔ رنج و راحت، خوشی اور غم کے باب میں ان کا تصور ہمارے تصورات سے یکسر مختلف تھا۔ ہم مسرتوں سے دامن بھر لینے کے آرزومند رہتے ہیں۔ اور اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ یہ مسرتیں جن کے حصول کی آرزو ہمیں شب و روز بے چین رکھتی ہے انہیں حاصل کرنے کے لیے جائز ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ ناجائز ذرائع سے جو مسرتیں حاصل ہوں گی، وہ ہماری حیات میں وہ تازگی پیدا نہ کر سکیں گی جو ایک مومن کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ حیات ہوتی ہے۔

جسم کی مسرت رُوح کی مسرت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ ایک انسان فاقہ کش ہونے اور راحت و آرام کے ساز و سامان سے محروم ہونے کے باوجود روحانی مسرتوں کا مالک ہو سکتا ہے اور ایک تاج خسروی سر پر رکھنے کے باوجود روحانی مسرت سے محروم رہ سکتا ہے۔

حقیقی مسرت روح کی مسرت ہے۔ اور یہ جنس زر و جواہر سے نہیں خریدی جا سکتی۔ کہ روحانی مسرت جنسِ بازار ہوتی تو اسے ہر کوئی خرید لیتا جتنے صاحبِ ثروت ہیں، روحانی طور پر مطمئن ہوتے، انہیں روحانی تسکین حاصل ہوتی اور ان کی ظاہری حیات کی طرح ان کی روح بھی

خوشیوں کے گہوارے میں جھومتی ہوئی نظر آتی لیکن جو خدا اس کائنات پر بے لاگ قانون کے ساتھ فرمانروائی کر رہا ہے اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہی بخوبی سمجھتا ہے۔ انسانی حیات کے لیے جو چیزیں ناگزیر تھیں، وہ اس نے اپنے کنٹرول میں رکھی ہیں، جو چیز جتنی زیادہ ضروری ہے۔ اسی قدر انسان کی دسترس سے باہر ہے اس پر اس کا اپنا کنٹرول ہے تاکہ اس سے مفلس اور تہی دامن انسان محروم نہ رہیں۔ ہوا حیاتِ انسانی کے لیے ضروری تھی، وہ اس نے اپنے قبضے میں رکھی۔ پانی انسانی حیات کے لیے ضروری تھا، وہ بھی اسی کے قبضے میں ہے، مسرت بھی حیات کا ایک لازمی جزو تھی، یہ بھی اپنے قبضے میں رکھی۔ جب چاہا اور جسے چاہا مسرتیں عطا کر دیں۔ بعض ایسے امیر دیکھے گئے ہیں، جو سب کچھ ہونے کے باوجود غذا سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ان کے معدے دائمی طور پر خراب رہتے ہیں۔ اور انہیں بھوک نہیں لگتی۔ بعض لوگوں کو نیند نہیں آتی یہ سب چیزیں قدرت کے انعامات و عطیات ہیں۔ مال و دولت ہی عطیہ نہیں، صحت بھی عطیہ ہے۔ ذوقِ سلیم بھی عطیہ ہے اور فاقہ مستی کی کیفیات کا نشہ بھی اس کا خاص انعام ہے۔ تقسیم اس کی اپنی ہے۔ کسی کو کچھ دے دیا اور کسی کو کچھ، بندگی کی شان تو یہ ہے کہ مبداِ فیاض سے جو کچھ ملا ہے اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ جس گدا کی نظر اپنے کاسے کی خیرات پر رہتی ہے

اس میں شکر پیدا ہو جاتا ہے اور جو دوسروں کی جھولی پر نظر رکھتا ہے وہ شکر کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے بندگی شان یہ نہیں، کہ انسان اپنے عطیات کو نظر انداز کر دے اور دوسروں کے عطیات پر للچائی ہوئی نظریں ڈالے شکر منعم کے جذبات کو متحرک کرنے کا موجب ثابت ہوتا ہے اور شکر سے غفلت نعمت کے زوال کا موجب بن جاتی ہے راہیں دونوں ہمارے سامنے ہیں خواہ ہم یہ اختیار کر کے مزید انعامات کے مستحق بن جائیں یا شکر سے محروم ہونے کے بعد ہلاکتوں کو دعوت دینے لگیں۔ قدرت کی طرف سے ہمیں دونوں کا اختیار دیا گیا ہے۔

حیات کی شادابیاں

خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں کی علامت یہ ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والوں کی روحیں عشق الٰہی کی مستی میں سرشار رہتی ہیں ان کے اعمال میں خود بخود انقلاب پیدا ہونے لگتا ہے۔ خوشبو سے انسان غیر ارادی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ آگ ارادہ ہو یا نہ ہو جلائے گی۔ ایمان کی حرارت بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ بشرطیکہ سینہ ایمان کی دولت سے معمور رہے۔ جو اصلاح کے مدعی زندگی بھر اپنے پاس بیٹھنے والوں میں تقویٰ کی شان پیدا نہیں کر سکے، وہ سوز، وہ مستی اور وہ خشیتِ ربانی جو مومن کا امتیازی

وصف ہوتا ہے کسی ایک انسان کو بھی عطا نہیں کر سکتے وہ اپنے دعوی میں
جھوٹے ہیں۔ مومن سے ربط ضبط رکھنے والا کبھی عشق کی مستی سے محروم
نہیں رہتا۔ اس کے کردار میں ایمان کی جھلک پیدا ہو کر رہتی ہے عمل
سے بڑھ کر کوئی قوت نہیں۔ یقین کا استحکام یقین پیدا کر کے رہتا ہے
پاکانِ بارگاہ کی حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صحبت انسان
ساز تھی، دلوں کے میل دھو دیتی تھی اور ان کیفیتوں سے مشا کر دیتی تھی
جو ایمان کی جان ہوتی ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جن کی عظمتیں آفتاب سے زیادہ درخشاں اور
تاباں ہیں خود فرماتے ہیں، کہ مجھے حضرت ایوبؒ محدث کی صحبت نے غیر
معمولی فائدہ بخشا ہے۔ حضور علیہ السلام کی ذات گرامی سے ان کے عشق کا
یہ عالم تھا کہ بیش تر اوقات کوئی حدیث بیان کرتے وقت ان پر عشق و
مستی کا یہ عالم طاری ہو جاتا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ ٹوٹنے
والا سلسلہ جاری ہو جاتا اور ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی یہی عشق
جو امام مالکؒ کے شفیق استاد کا سرمایہ حیات تھا۔ شاگرد کے رگ و
ریشے میں سرایت کر گیا۔ اور وہ اپنے بزرگوں کی اس میراث کو لے کر اپنی
منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوسروں کو بھی انہوں نے اس میراث
میں حصہ دار بنایا جو متاع اپنے پاس تھی۔ نہایت فیاضی سے تقسیم

کی۔ حدیث کا کوئی منکر اس متاع سے حصہ گیر نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی عشق رسولؐ میں اس کی آنکھیں تر ہو سکتی ہیں اور نہ ہی کسی سینے میں ان کیفیتوں کو بیدار کر سکتا ہے جن کی بدولت صحابہؓ بے سروسامان ہونے کے باوجود دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ سوز سے محرومی، عشق سے بیگانگی اور ذوق و شوق سے ناآشنائی حدیث سے انکار کا لازمی نتیجہ ہے۔ آئمہ شریعت اور آئمہ طریقت کے دامن میں یہ متاع موجود تھی تو یہ عشقِ رسولؐ کا فیضان تھا۔ نسبت ہی نہ ہو تو سوز کیسا؟

سوز و گداز تو محبت کے فیوض ہوتے ہیں، خاکم بدہن محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی نفی کرنے کے بعد سوز و گداز کہاں سے مل سکتا ہے، تپش آگینی کیسے میسر آسکتی ہے آنکھوں میں آنسوؤں کے وہ خزینے کہاں سے آسکتے ہیں جن کی رحمت خریدار ہوتی ہے؛ محبت کا بازار دنیا کے بازاروں سے یکسر مختلف بازار ہے۔ یہاں قبولیت اُسی جنس کو ملتی ہے جو محبت کی منڈی سے لائی گئی ہو جس کی اصل سوزِ صدیقؓ و بلالؓ ہو۔ اربابِ عشق کے اس زمرے سے کٹ کر انسان متقی تو ہو سکتا ہے لیکن ان کیفیات کا حامل نہیں ہو سکتا جو فیضانِ نبوت ہوتی ہیں، جو اہل دل کو خواجہؐ بطحیٰ کی غلامی سے ملتی ہیں اور جن کے فیضان کا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ خدا میں سوز نہیں۔ سوز عجز کا خاصہ ہے اور خدا عجز سے پاک ہے۔ سوز کا مخزن محمد عربی فداہ امی

والی کا دل ہے، یہ یہیں سے ملا تھا اور یہیں سے ملے گا۔

ایمان اور توبہ

محبت کے بغیر کسی ذات کی کامل اطاعت ممکن نہیں۔ قانون کے خوف سے اگر کوئی اطاعت گذار بن بھی جائے تو اس کی اطاعت کی حد وہیں تک ہوں گی، جہاں تک قانون کی رسائی ممکن ہو۔ قانون کے ذریعہ دل کو مسخر نہیں کیا جا سکتا۔ دل کی تسخیر محبت ہی سے ممکن ہے۔ اسی لیے ایمان کا مقام دل تجویز کیا گیا ہے۔ قلبی تصدیق کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ عقل کو دل پر فوقیت حاصل ہوتی تو تکمیلِ ایمان کے لیے قلبی تصدیق کی بجائے عقلی تصدیق کو ضروری قرار دیا جاتا۔ لیکن اس بارگاہ میں عقل معتبر نہیں دل کے فیصلے معتبر ہیں۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پہ پرکھنے والے یہ نہیں سوچتے کہ ایمان قلبی چیز ہے، عقلی نہیں۔ غیب پر ایمان لانے کے لیے عقل کب تیار ہو سکتی ہے؟ نادیدہ محبوب کی طلب میں صرف محبت ہی چاک گریبان نکل سکتی ہے۔ اور ساتر پردوں میں چھپے ہوئے حسن کی حقیقتوں سے آگاہی بھی اسی کو ہو سکتی ہے دل کا راز بھی دل ہی پا سکتا ہے۔ عقل کو محرم راز بننے کی سعادت نصیب نہیں ہو سکتی۔ دل ہمیشہ اپنا راز دل کو دیتا ہے

عقل کو نہیں عقل کے مخصوص دائرے میں جہاں وہ اپنی جولانیاں دکھا سکتی ہے۔ اپنی برتری تسلیم کرا سکتی ہے۔ محبت کی دنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہاں پہنچ کر نہ اس کی قوت پرواز باقی رہتی ہے نہ اس کے وہ دم خم ہوتے ہیں جو وہ اپنی حدود کے اندر رہ کر دکھا سکتی ہے۔ دلیل کو دلیل سے توڑا جا سکتا ہے لیکن محبت کے فیصلوں کو دلیل نہیں توڑ سکتی۔ یہاں آکر اسے سپر انداختہ ہونا پڑتا ہے۔

صحابہؓ کی محبت چونکہ اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز تھی۔ اس لیے انہوں نے نبوت کے فیصلوں کو کبھی عقل کی ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں بھی تولی وہ چیز جاتی ہے جو کثیف ہو لطیف کو بھی کبھی کسی نے تولا ہے۔ محبت خود لطیف ہے اس کے فیصلے بھی لطیف ہوتے ہیں۔ لطائف کو تو محسوس کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق عقل کی میزان سے نہیں احساسات سے ہوتا ہے۔ خوشبو لطیف ہے وہ تل نہیں سکتی محسوس کی جاتی ہے۔ اب اگر عقل کا کوئی اندھا خوشبو تولنے کی کوشش کرنے لگے تو اسے بجز فاتر العقل ہونے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ محبوب کے فیصلے عقل میں تلنے والی چیز ہوتے تو پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانے والے عشاق نہ جانے کتنے ترازو ایجاد کر چکے ہوتے۔ محبوب کے فیصلوں کو تو احساسات کے ذریعہ ہی جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ احساسات ہی ان کی اہمیت سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان

کی قدر کر سکتے ہیں۔ احساسات ہی مردہ ہوں تو وہ کیا سمجھیں گے اور کیا لطف اندوز نہ ہوں گے؟

اسی لیے اسلام نے دل کی زندگی پہ زور دیا ہے۔ آخرت میں بھی انہی لوگوں کی پذیرائی ہو گی۔ جو قلب سلیم لے کر حاضر ہوں گے عقل کی طرفہ کاریاں لے کر حاضر ہونے والوں کا کوئی مذکور نہیں۔ دل کو قیل وقال سے زندگی نہیں ملتی۔ اس کھیتی کو سرسبز و شاداب کرنے کے لیے آنسوؤں کا پانی درکار ہوتا ہے اور آنسوؤں کا پانی عقل کے دامن میں نہیں یہ رم جھم محبت کی زمین سے اٹھنے والے بادلوں کے خرام کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بارش بالعموم گرد آلود مطلع کو صاف کر دیتی ہے۔ فضاؤں کے حسن کو نکھارتی ہے۔ وہی فضائیں جو دھندلی نظر آتی ہیں۔ دل فریب نظر آنے لگتی ہیں۔ نیناں سے بھی جب ندامت کے آنسو برستے ہیں تو گناہوں کی گرد دھل جاتی ہے؛ دل کی فضاؤں میں نیا حسن اور نیا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس باغ میں کبھی خزاں آئی ہی نہ تھی۔ خزاں نے برگ و بار کو متاثر ہی نہیں کیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے والا یوں پاک ہو جاتا ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ نئی بہار کے آنے کے بعد چمن کی رعنائیاں خزاں کے اثرات زائل کر دیتی ہیں۔ توبہ بھی حیات انسانی کے مرغزاروں میں نئی بہار کی حیثیت رکھتی ہے۔

محبّت کی سوداگری

اعتماد، تعلق کی جان ہوتا ہے، جہاں تعلق ہو، اعتماد بھی ہوگا۔ مریض کو ڈاکٹر کی ذات پر اعتماد ہوتا ہے، تو وہ اس کے عملِ جراحی سے بھی نہیں گھبراتا، جسم کا حصہ کاٹ کر پھینک دینے سے بھی اس میں بے اعتمادی پیدا نہیں ہوتی۔ تعلق کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ بداعتمادی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا، جہاں بے اعتمادی پیدا ہو جائے، وہاں تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تعلق جب تک باقی رہتا ہے، اعتماد بھی قائم رہتا ہے۔ بداعتمادی عدمِ تعلق کی دلیل ہوتی ہے۔ اسلام میں مایوسی کو کفر کیوں کہا گیا ہے؟ اسی لیے کہ مایوسی تعلق کے ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہے جب بندے کا مولا سے تعلق ٹوٹ گیا تو اسلام کیسا؟ ایمان کے کیا معنی؟ ایمان تو محبت ہے اور محبت کسی حال میں بھی مایوس ہونا نہیں جانتی، مصائب و آلام میں گھر کر بھی وہ دوست کی معاونت کی اُمیدوار رہتی ہے۔ مدد نہ پہنچنے پر بھی وہ اس خیال میں مبتلا رہتی ہے کہ دوست کو میرے حال کی خبر نہیں ہوئی میری پریشانیوں سے آگاہ ہونے کے بعد وہ میری مدد کو ضرور پہنچے گا یہ ناممکن ہے کہ

میرا بُرا حال ہو اور اس کے سینے میں کوئی ٹیس نہ اٹھے، محبت کا کوئی جذبہ بیدار نہ ہو، اور اسے میری مدد کا خیال نہ آئے۔ اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ تمہارے دوست نے جان بوجھ کر تغافل برتا ہے، لیکن اسے یقین نہیں آئے گا۔ جذبات کی صداقت یہی کہے گی کہ تم جھوٹ کہتے ہو، میرا دوست ایسا نہیں، وہ مدد کو ضرور پہنچے گا، مدد کے بغیر اسے چین نہیں آسکتا۔ ایسے تمام تر جذبات تعلقِ خاطر کا نتیجہ ہوتے ہیں، جہاں تعلق نہ ہو، وہاں معاونت کا خیال بھی نہیں آتا۔ اس پر کوئی اعتماد نہیں کرتا، اور مصائب و آلام میں گھر کر نظریں اس طرف نہیں اٹھتیں، اسے نہیں پکارا جاتا۔ پکارا اسی کو جاتا ہے، جو دل میں بسا ہو، جو رگ رگ میں سمایا ہو، جس کی یاد کو روح پرور اور جاں نواز سمجھا جائے۔ محبت ہمیشہ خوش گمان ہوتی ہے۔ وہ دوست پہ بداعتمادی کو کفر جانتی ہے۔ اعتماد ہی اس کی جان ہوتا ہے، اور اعتماد ہی سرمایۂ حیات، وہ جان دے کر بھی یہ سرمایہ ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ محبت کے دامن میں سب کچھ کھونے کے بعد اور ساری ذلتیں اور رسوائیاں برداشت کر لینے کے باوصف بھی اگر اعتماد کا سرمایہ موجود ہو تو وہ سرمایہ دار کہلاتی ہے، قارون کے خزانے اس کی نگاہ میں ہیچ ہوتے ہیں۔ دنیا کی عظمتوں اور راحتوں کو وہ ہیچ جانتی ہے۔ وہ لٹتی تو اس وقت ہے جب اس کا سرمایۂ حیات لُٹ جائے۔ وہ ساز و سامان

ختم ہو جائے، جس پہ اس کی حیات کا دار و مدار ہوتا ہے۔ محبت کا سرمایہ قارون کے خزانے نہیں ہوتے۔ یہی یقین و اعتماد اس کی دولت ہوتی ہے، اور اس نے ہمیشہ اسی دولت پہ ناز کیا ہے۔ اسی کو عزیز جانا ہے۔ اسی کی طلب کی ہے، اور اسی سے تاب و تواں حاصل کی ہے۔ چراغ میں تیل ختم ہو جائے۔ تو وہ بجھ جاتا ہے۔ کسی کو نور عطا نہیں کر سکتا۔ محبت کے چراغ کی ساری نور پاشیوں اور جان نوازیوں کا انحصار یقین و اعتماد پہ ہوتا ہے، اسی سے اسے زندگی ملتی ہے، اور اسی سے فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جس حیات کا دامن یقین و اعتماد کی دولت سے خالی ہو اسے نہ ہی زندگی مل سکتی ہے، اور نہ ہی فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ کسی پہ اعتماد نہ کیا جائے تو وہ مدد کو کیسے پہنچ سکتا ہے؟ پکارا نہ جائے تو لبیک کی صدا کہاں سے آئے گی؟ محبت کی پکار کبھی رائیگاں نہیں گئی۔ اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگی۔ اس نے جب بھی پکارا ہے کامیاب ہوئی ہے جب بھی اعتماد کیا ہے نوازی گئی ہے۔ نوازش و کرم اس کا حصہ ہے الطاف و عنایات اس کا مقدر ہیں محرومیاں تو ہوس کا حصہ ہیں جو ازل سے محروم چلی آرہی ہے اور اب تک محروم رہے گی۔ اس کی صدائیں نہ کبھی سوز پیدا ہوا ہے اور نہ ہی اس کی آواز پہ کسی کا دل پسیجا ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ کی صدا پہ حضور کو قلق و اضطراب کیا تھا؟ وہ محبت کی پکار کا جواب ہی

تو تھا جس نے صدیق رضؓ کو سارا سرمایۂ حیات لے کر امیہ کے دروازے پہ دستک دینے کے لیے مجبور کر دیا تھا وہ خریدار بن کر پہنچ گئے۔ خریدار کون تھا؟ وہ بھی محبت ہی تھی جو صدیقؓ کے لباس میں طالب بن کر کھڑی تھی۔ محبت جب بکاؤ مال بن کر بازار میں آجاتی ہے تو محبت ہی کو خریدار بن کر نکلنا پڑتا ہے ہوس نہ کبھی بکی ہے اور نہ اسے کسی نے خریدا ہے۔ تڑپنا اور تڑپانا، مضطرب ہونا اور مضطرب کر دینا صرف محبت کا خاصہ ہے، وہ سب کچھ نثار کرنے کے بعد بھی یہی کہتی ہے کہ سستا خریدا، مال گراں تھا سستا مل گیا، ورنہ جان کی قیمت بھی کوئی قیمت ہے؟ اس متاع کی قیمت تو دونوں جہان بھی نہیں ہو سکتے۔

سکون اور محبت

اندھے کی لاٹھی اس کی رہبری نہیں کرتی بلکہ اندھے کا وہ ارادہ لاٹھی کا رہنما بن کر اسے واصلِ منزل کر دیتا ہے۔ جو محبت کے بطون سے ظہور پاتا ہے۔ دل میں لگن موجود نہ ہو تو دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ لگن ہی ولولۂ شوق بخشتی ہے اور لگن ہی رہنما بن کر کشاں کشاں منزلِ شوق پہ پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ محبت کو اسی لیے ایمان کی اساس اور

بنیاد قرار دیا گیا ہے کہ یہی اعمال کی خالق ہوتی ہے۔ سرفروشیوں اور جاں نثاریوں کا جذبہ اسی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ یہ خود سرفروش ہے اسی لیے سرفروشی کی تعلیم دیتی ہے۔ یہ خود جان نثار ہے اسی لیے وہ جان نثاری کے جذبات کی تخلیق کرتی ہے۔ عقل نہ سرفروش ہے نہ جاں نثار وہ سرفروشی کے جذبات پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ سعادت ازل ہی سے محبت کے حصے میں آئی ہے بدر وحنین کے معرکے کیا تھے؟ محبت کے ولولہ انگیز مظاہر۔ صحابہؓ کی جاں نثاریاں کیا تھیں؟ عشق کی مرتب داستانیں اور جذبات کے سمندر کی ابھرتی اور مچلتی ہوئی موجیں، جو کفر و شرک کی دیواروں سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دیتی تھیں۔ موج کی فطرت میں اضطراب ہوتا ہے وہ انجام سے بے نیاز ہو کر ٹکراتی ہے یا مٹ جاتی ہے اور یا ساحل کو آغوش میں لے کر روپوش ہو جاتی ہے دریا ہی سے اٹھتی ہے اور دریا ہی میں غائب ہونے کے بعد اسے سکون ملتا ہے۔ مومن کا وجود بھی دریائے معرفت سے ابھرنے والی موجوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ دریائے ناپیدا کنار کے سینے سے ابھرا ہے اور اسی میں سکون پذیر ہو کر اسے چین آسکتا ہے۔ مضبوط چٹانوں کی دیواریں اس کی راہ نہیں روک سکتیں۔ راہ میں جو بھی آئے گا پاش پاش ہو کر رہے گا۔ ریزہ ریزہ ہو گا۔ اور اگر خس و خاشاک کے انبار اس کی راہ میں حائل ہو کر اس کی رفتار

روک دیں، اس کے اضطراب، شوق میں کمی کا موجب ثابت ہوں تو اس کا
ایمان مضبوط نہیں خس و خاشاک نے کب موجوں کا راستہ روکا ہے۔ ایمان
کی فطرت کو بدلا ہے اور ان کے پیچ و تاب میں کمی کا موجب ثابت ہوئے
ہیں؟ چند تنکے مل کر اگر موج کا اضطراب کم کر دیں، اس کی فطرت کو بدل
دیں اور اس کے اضطراب میں کمی کا موجب ثابت ہوں تو وہ موج موج
نہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ چند حباب کی موزوں صورت کہا جا سکتا ہے۔
جو ایمان کفر سے خائف ہو، جو حق، باطل کے سامنے جھک جائے اور
جو محبت، ہوس کے سامنے سپر انداختہ ہو جائے اس کی فطرت میں کجی ہوگی
جس حق کی بنیاد ایمان کے ولولہ انگیز جذبات پر مبنی ہو وہ باطل کے سامنے
سرنگوں نہیں ہو سکتا۔ ایمان کے ولولہ انگیز جذبات کا مالک۔ انسان باطل
کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے، وہ باطل کو جھکا کر اور مٹا کر دم لے گا۔ باطل
سے لڑتے ہوئے اگر اس کے جسم و روح کا پیوند بھی جدا ہو جائے اور
حالات کے سمندر کی موجیں اسے نیم جان کر کے ساحل پر پھینک دیں
تو اس کی روح پھر بھی شکست نہ کھائے گی۔ وہ خود کو انتہائی کامیاب
اور بامراد سمجھے گا۔ محبت کی دنیا میں کامیابی کا جو مفہوم ہے وہ اس مفہوم
سے یکسر مختلف اور جداگانہ ہے۔ جو اربابِ ہوس نے قرار دے رکھا ہے۔
ان کے نزدیک کامیابی فتوحات سے عبارت ہے لیکن محبت کی تسخیر

اور کامیابی دنیا کے تمام فرمانرواؤں کی تسخیر اور کامیابی سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں مٹ کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ سب کچھ لٹانے اور نچھاور کر دینے کے بعد اقلیمِ محبت کی تسخیر معرضِ وجود میں آتی ہے۔ ہوس دم توڑتی ہے تو ہوس کو اس پہ نثار ہونے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی محبت جادۂ شوق میں مٹتی ہے اس کا خون بہتا ہے تو وہ تاریخِ محبت کا جلی عنوان بن کر دنیائے محبت کو نئی رنگینیاں عطا کر دیتا ہے۔ ان پر محبت بھی نثار ہوتی ہے۔ اور شوق بھی اہلِ محبت انہیں رنگینیوں سے تاب و تواں لے کر منزلِ شوق کی طرف نئے جذبے اور ولولے سے دوڑنے لگتے ہیں۔ ان کا اضطراب اس وقت تک کم نہیں ہوتا جب تک وہ محبوبِ حقیقی کی آغوش میں پہنچ کر سکون نہیں پا لیتے۔ ہوس کو ہوس کی آغوش میں سکون نہیں ملتا۔ یہ محبت ہی کی فطرت ہے کہ وہ محبت کو آغوش میں لے کر سکون بھی پاتی ہے۔ اور سکون کی دولت بھی عطا کرتی ہے۔ خود بھی جھومتی ہے اور آغوش میں آنے والے کے جذبات کو بھی آسودگی بخشتی ہے۔ ہوس کی آغوش ازل سے سکون ناآشنا ہے یہ اہلِ محبت کا حصہ ہے اور انہیں ملی کر رہتا ہے۔

رضا کی منزل

قدیم زمانۂ جاہلیت میں شعرائے عرب کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے ممدوح کی بارگاہ میں پہنچ کر فوراً وہ قصیدہ پیش نہیں کر دیتے تھے، جو انہوں نے اپنے ممدوح کی شان میں لکھا ہوتا تھا۔ ان کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ اپنے سواری کے جانور کی کونچیں کاٹ دیتے تھے اور تلوار توڑ دیتے تھے ایسا کرنے سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ منزل پر پہنچ کر سامان سفر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ سواری کا جانور اس لیے تھا کہ اس کے ذریعے سفر قطع کیا جائے۔ تلوار جان کی حفاظت کے لیے تھی اب سفر بھی ختم ہو چکا ہے اور ایک عظیم قوت کی پناہ میں آجانے کے بعد امن بھی مل گیا ہے تو اب ان چیزوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

عارفین حق کا معمول بھی یہ ہے کہ وہ رضا کی منزل میں داخل ہونے کے بعد خواہشات کے گھوڑے کی کونچیں بھی کاٹ دیتے ہیں۔ اور اختیارات کی تلوار بھی توڑ دیتے ہیں۔ ان کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ رضا کی منزل میں داخل ہونے کے بعد ہمارا لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں

اب ارادہ ہمارا نہیں، ارادہ اس قادر قیوم ذات کا ہے جس کے حریم جمال کو
ہم نے دار الامان کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہے جہاں نہ کسی دشمن کا
اندیشہ ہے نہ احتیاج کا غم بس امن ہی امن ہے۔ چین ہی چین ہے سکون
ہی سکون ہے راحت ہی راحت ہے، یہ جگہ نہ سود و زیاں کے
اندیشوں کی ہے نہ ذہنی و قلبی پریشانیوں کی۔ ذہنی اور قلبی پریشانیاں
تو وہاں ہوتی ہیں جہاں میزبان مہمان کی ضرورتوں سے ناواقف ہو، یا
اس کی فطرت میں بخل ہو۔ اسے اپنے خزانے کے گھٹنے کا اندیشہ دامن
گیر رہے۔ اور اسی اندیشے کے پیش نظر وہ مہمان کی ضرورتوں سے صرفِ
نظر کرے۔ اس بارگاہ میں ایسی کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی۔ نہ
میزبان کا علم ناقص ہے کہ اسے مہمان کی ضرورتوں کی خبر نہ ہو۔ اور نہ ہی
اس کے خزانے محدود ہیں اور اس کے علم کی بھی کوئی حد نہیں۔ اور
اس کا دریائے جود و کرم بھی بے پایاں ہے پھر مہمان نوازی میں کیا کسر
باقی رہ سکتی ہے؟ دنیا والوں کا بھی جب یہ دستور ہے کہ مہمان کی تواضع
اور خدمت میں کمال درجے کی فیاضی اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہیں؛
تو اس کریم ذات سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ رضا کی منزل میں
آجانے والے مہمان کو بھوکا پیاسا رکھے گی اس کے جذبات و احساسات
کی رعائت نہیں برتے گی؟ دنیا کا مہمان تو اپنے میزبان کے محدود علم کی

بنا پر ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی تمام کوششوں اور کاوشوں کے باوجود کبیدہ خاطر رہے۔ میزبان اس کے ذوق کی تشنگی کو ملحوظ رکھے لیکن اس کے جذبات کا اندازہ لگانے سے قاصر رہے۔ خدا کے مہمان کو یہ صورت پیش نہیں آسکتی۔ وہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی، علیم بھی ہے اور خبیر بھی، اس سے نہ ظاہر چھپا ہے نہ باطن، نہ خیالات کی رو اس کی دسترس سے باہر ہے، اور نہ ہی احساس کی دنیا کا کوئی گوشہ اس کے علم سے باہر ہو سکتا ہے۔ احساسات کے تاروں سے نکلنے والے نغموں کی ہر لے سے بھی وہ واقف ہے اور افکار و خیالات کے حجابوں میں چھپی ہوئی ہر حقیقت بھی اس کی نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی مشیت کے سامنے ظاہر و باطن یکساں ہیں۔ ایسی ذات اگر مہمان نواز بن جائے اور کسی مہمان کو اس کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہو جائے تو اسے کس چیز کی ضرورت باقی رہ سکتی ہے؟

ہر میزبان کی نعمتیں اپنے دوستوں کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ دشمن کو اپنے گھر میں کون ٹھہراتا ہے؟ اس کی خاطر و مدارت کون کرتا ہے؟ خصوصاً جب کہ یہ معلوم ہو کہ آنے والے کی نیت ٹھیک نہیں یہ ہمارے دشمن کا کارندہ ہے اور اس کی تمام صلاحیتیں اس کی رضا جوئی کے لیے وقف ہیں۔ شیطان کے کارندے رحمان کی بارگاہ میں مہمان نوازی

کا لطف نہیں اٹھا سکتے یہ سعادت ان ہی لوگوں کا حصہ ہوتی ہے، جو شیطان سے کٹ کر رحمان کے ہو جاتے ہیں۔ رحمان ہی کی بارگاہ ان کی آخری پناہ گاہ قرار پاتی ہے۔ سکون بھی ان کے لیے ہوتا ہے اور راز و نیاز کی لذتیں اس پر مستزاد ہوتی ہیں۔ کیونکہ راز میں دوست کو شریک کیا جاتا ہے، دشمن کو نہیں۔ دشمن سے تو راز چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ متقیوں پر اسرارِ معرفت کھلتے ہیں، گمراہ انسان نہ قرآن کے اسرار و معارف سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان پر معرفت کی راہ کھلتی ہے۔ قرآن ان کی مزید گمراہی کا موجب بن جاتا ہے۔

جلوہ گر اور جلوہ گری

دنیا کی بارگاہوں میں مقبول بننے کے لیے ظاہری آسائش و زیبائش کی ضرورت ہوتی ہے لیکن خدا کی بارگاہ میں مقبول بننے کے لیے باطنی تطہیر کی ضرورت ہے۔ اہل دنیا کی نظریں چونکہ محدود ہوتی ہیں ظاہر ہی پر پڑتی ہیں اور ظاہر ہی کو دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں، اس لیے ظاہری حال ہی ان کے نزدیک انسانی مجد و شرف کا موجب بنتا ہے باطن سے انہیں کوئی سروکار

نہیں ہوتا۔

خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں مقرب بننے کا معیار چونکہ باطنی تطہیر ہے۔ وہ پاکیزگی ہے جو آلائشوں سے پاک ہو۔ جس کے آئینے کو معصیب کے گرد و غبار سے محفوظ رکھا جائے اس لیے کہ خدا تعالیٰ ظاہر کو نہیں، باطن کو دیکھتا ہے۔ اور باطنی تطہیر ہی کی نسبت سے انسان کو اپنا قربِ خاص عطا کرتا ہے۔ تطہیر جتنی اعلیٰ ہو گی باطن اتنا اجلا ہو گا۔ اس کی نسبت سے قرب حاصل ہو گا۔ ظاہر خواہ کتنا بھی آراستہ و پیراستہ کیوں نہ ہو، اگر باطن درست نہ ہو، باطن میں گناہوں کے اندھیرے چھائے ہوں تو اس میں نور ضیا ریز نہیں ہو سکتا۔ ہر حسین کو اجلا آئینہ درکار ہوتا ہے۔ جس میں وہ اپنے جمال کی تابشیں دیکھ سکے۔ ان نقش و نگار کا مشاہدہ کر سکے جو اس کے حسن و جمال کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور جن کے ذریعہ جمال کی برتری قائم ہو سکتی ہو

گرد و غبار سے اَٹے ہوئے اور جوہر سے محروم آئینے کو ظاہری حسن کی نگاہیں جمال بینی کے لیے منتخب نہیں کرتیں۔ پاک صاف اور شفاف آئینے ہی کو حسن نے ہمیشہ اپنی جمال بینی کے لیے منتخب کیا ہے حسنِ مطلق کی نگاہوں میں بھی وہی آئینہ قابلِ تکریم قرار پاتا ہے، جو دلآویز ہو، حسین و جمیل ہو۔ جس میں حسن کے جلوے سمٹنے اور

آشکارا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ دل میں بھی اگر صلاحیت
پیدا ہو جائے تو وہ محروم جمال نہیں رہتا ناقابلِ التفات
نہیں سمجھا جاتا اِس پر توجہ ہوتی ہے حسن بر انگندہ نقاب ہو کر
اس کے سامنے آتا ہے۔ اسے اپنے جمال کی لطافتوں سے نوازتا
ہے اور اسے پیشِ نظر رکھ کر اس کے ذوقِ جمال کو تسکین ملتی ہے
اپنی ذات صفات کا مظہر ہر ذات کو عزیز ہوتا ہے صفات کا مظہر
بن جاتا ہے تو اس میں صفات جلوہ ریز ہونے لگتی ہیں ذات کو ذات میں
سمیٹ لیتا ہے، تو ذات آشکارا ہونے لگتی ہے۔ ذات میں جو خصوصیات
ہوتی ہیں انہی کے عکس سے اپنی ذات متجلی اور مستنیر نظر آنے لگتی ہے۔ اپنے
حسن کی تجلیوں کو کوئی ذات ضائع نہیں ہونے دیتی۔ کوئی حسین اپنے آئینے
کا ٹوٹنا گوارا نہیں کرتا۔ آئینہ اسے اس لیے عزیز ہوتا ہے کہ وہ اس کے حسن
کا مظہر ہوتا ہے۔ دل بھی جب تجلیات ربانی کا مظہر بن جاتا ہے تو اس کی
حفاظت شاہد حقیقی کے ذمے ہوتی ہے۔ وہ ٹوٹنے سے بھی محفوظ رہتا ہے
اور گرد و غبار بھی اس کے جمال کی لطافتوں کو مجروح نہیں کر سکتے محسنِ
مطلق اس کی ذات و صفات دونوں کی حفاظت کرتا ہے۔ حسن کی فطرت
ہی یہ ہے، کہ وہ اپنے جمال کے آئینے کو ٹھوکروں سے محفوظ رکھنے کے لیے
اعلیٰ اور ارفع مقام پر رکھتا ہے۔ گرد و غبار صاف کرنے کے لیے حسن

کے ہاتھ بڑھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کو وہ اپنے جمال کی لطافتوں کی حفاظت
کو وہ اپنے جمال کی لطافتوں کی حفاظت کے مترادف سمجھتا ہے۔ احساس
کے اس اشتراک کا باعث وہ لطافتیں ہوتی ہیں جو حسن اور آئینے میں مشترک
ہوتی ہیں۔ یہ وجۂ اشتراک ختم ہو جائے تو دونوں میں کوئی نسبت نہیں رہتی،
ایک کی دوسرے سے نسبت ختم ہو جاتی ہے نہ آئینہ ہی حسن کے پیش نظر رہتا
ہے اور نہ اس کی پامالی ہی حسن کو پریشان کرتی ہے۔

دل کو بھی حسن حقیقی سے کوئی نسبت نہیں رہتی تو اس کی پامالی حسن حقیقی کے
دل میں اضطراب پیدا نہیں کرتی۔ اضطراب اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب
دل میں مظہر ذات و صفات بننے کی صلاحیت موجود ہو، وہ ذات کو بھی
آشکارا کرے گا اور صفات کو بھی۔

ظاہر اور باطن

گلاب کا پھول کسی کمرے میں رکھ دیا جائے تو پوری فضا مہک اٹھے
گی غلاظت موجود ہو تو دماغ پھٹنے لگے گا۔ جس طرح گلاب کی خوشبو سے
کیف گیر ہونے کے لیے کتابوں کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ علم کا کام
نہیں دیتا۔ مشامِ جاں کو معطر کرنے کے لیے گلاب کے پھول کا پاس

ہونا ضروری ہے۔ ایسے ہی ایمان کا علم بھی اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک سینہ ایمان کی دولت سے مالا مال نہ ہو۔

یہ ممکن نہیں کہ گلاب کا پھول موجود ہو اور قریب بیٹھنے والوں کو خوشبو نہ آئے۔ ایمان کی دولت بھی اگر پاس ہو تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے شیریں ثمرات سے دوسرے لطف اندوز نہ ہوں۔ گلاب کے ایک پھول میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو یہ سمجھ لیا جائے کہ ایمان، گلاب کے پھول سے بھی کمتر درجہ کی چیز ہے جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں؟ جس طرح کاغذ کے پھول محض نمائشی ہوتے ہیں، ان سے خوشبو نہیں آسکتی۔ ایسے ہی نمائشی ایمان سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ دوسروں پر کوئی مفید اثر ڈال سکے گا۔ ایمان وہی سودمند ہو سکتا ہے جو رگ و ریشے میں بسا ہو، حوادث کی آندھیاں جسے متزلزل نہ کر سکیں۔ حیاتِ انسانی اگر اضطراب و انتشار کا مورد بنی ہو۔ نہ دل میں سکون ہو نہ زبان پہ خدا کا نام۔ بدگوئی، بدزبانی اور ایسی ہی بُری صفات انسان سے چمٹی ہوں۔ تو انہیں ایمان کے ثمرات نہیں کہا جا سکتا۔

درخت اگر پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو مومن کو جانچنے کا معیار بھی اس کے اعمال ہیں، جہاں اعمال کی دلکشی نظر آئے، گفتار میں صداقت، کردار میں جاذبیت و کشش دکھائی دے تو اسے ایمان کی علامت کہا جا سکتا

ہے۔ اس عاشق کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے جو کسی محبوب کی محبت کا دم بھی بھرے، اپنی چرب زبانی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں بھی مصروف ہو کہ محبوب سے زیادہ اسے کوئی چیز عزیز نہیں لیکن وہ اس کی رضا جوئی کے لیے اپنا معمولی سا مفاد بھی قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہو، شب و روز ان فوائد کو حاصل کرنے کی فکر میں رہے جو اسے محبوب کی ذات سے وابستگی کے بعد حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اپنے مفاد کی فکر میں ہو۔ ایسی مصنوعی محبت بھی کس کام کی ؟ دوست اسے مطلب پرست جان کر کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے مالک حقیقی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم اس کی محبت کا دم بھی بھریں اس کی بندگی کا اعتراف بھی کریں۔ لیکن اس کی رضا جوئی کے لیے اپنا معمولی سا مفاد قربان کر دینے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اور وہ ہمیں اپنے خاص بندوں کی صف میں شامل کر لے ؟

سوال یہ ہے کہ کیا بندگی کے بھی کچھ تقاضے ہیں یا نہیں ؟ کیا عمل کی قوت سے محروم ایمان خدا تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کافی ہو سکتا ہے ؟ ایمان کا کیا یہی مفہوم ہے کہ مسلمان بن کر اور مسلمانوں کی صف میں شامل ہو کر ہمیں جو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کے حصول کے لیے تگ و دو میں مصروف رہیں۔ لیکن بندگی کے ان تمام تقاضوں کو نظر انداز کر دیں۔ جو ایک مومن کا امتیازی وصف ہوتے ہیں ایسی بندگی سے خود کو

فریب دینے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور اس طرح کے لوگ جو محض ذاتی
مفاد حاصل کرنے کے لیے کسی جماعت میں شامل ہو جائیں جماعت کے
لیے مفید نہیں ہوتے۔ شمولیت انہی لوگوں کی قابل فخر ہوتی ہے جو اخلاص
کا پیکر ہوں۔ ایثار ان کی فطرت میں ہو اور جماعتی مفاد کے لیے انہیں جو نقصانات
پہنچیں ان سے کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ بلکہ ان نقصانات کو فخر و مباہات کا موجب
جان کر قدم آگے بڑھائیں۔ کم ہمت، خود غرض اور دوں فطرت لوگ
جہاں کہیں بھی ہوں گے ذلت کا سامان بن جائیں گے۔ اور اسلام دامن میں
تو ایسے لوگوں کے لیے مطلقاً کوئی گنجائش نہیں۔ یہ شیر مردوں، غازیوں اور
شہیدوں کا دین ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کو پیار کی نظر سے دیکھتا ہے۔

محبّت کا جام

سفر میں لگن ہی ایک مسافر کا قیمتی اثاثہ ہوتی ہے ساز و سامان کی موجودگی
کے باوجود اگر دل جذبات سے خالی ہو تو دشوار گذار راہیں عبور نہیں کی
جا سکتیں۔ بعض سفر صرف عقل سے طے کیے جا سکتے ہیں۔ اور بعض میں جذبات
کی تندو تیزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبات میں تلاطم موجود نہ ہو تو انجام کی
ہلاکت خیزیوں کا تصور دو قدم بھی چلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ سینہ جذبات

سے معمور ہو اور منزل کی طلب طوفان بن کر ظاہر ہونے لگے تو نظر انجام کی ہولناکیوں پہ نہیں ہوتی۔ شوق کی فراوانی مشکلات کو آسانیوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ آسان راہیں عقل کے ذریعے طے کی جا سکتی ہیں لیکن مشکلات کے جھکڑ چنگھاڑتے طوفانوں میں عقل کی مصلحت اندیشیاں کام نہیں دیتیں۔ یہاں سرشار جذبات کی ضرورت ہوتی ہے، جو خود مست و سرشار ہوں اور مست و سرشار کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

آسان راہوں میں عقل کی مصلحت اندیشیاں مفید ثابت ہو سکتی ہیں اور وہ سفر کو آسان تر بنا سکتی ہیں، لیکن مشکلات کے طوفانوں میں گھری ہوئی راہوں میں محبت کے دیوانہ پن ہی کا چراغ جل سکتا ہے۔ ہوش کی راہ کو جوش کے ذریعے طے نہیں کیا جا سکتا، اور جوش کی راہ میں ہوش کے چراغ نہیں جل سکتے۔ یہاں انجام سے بے نیاز محبت بھرے جذبات ہی کو رہبر بنایا جا سکتا ہے، انہی کی رہبری قبول کرنی پڑتی ہے۔ جذبات کی تند و تیز صہبا سفر کے شدائد کو کم کر دیتی ہے۔ سفر کی سختی محسوس نہیں ہونے دیتی۔ کٹھن سفر مستی کے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ دو قدم چلنے سے دل بیٹھنے لگتا ہے اور حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔

مستی سے محروم مسافر سے حوصلہ شکن راہوں میں کسی حیرت انگیز کارنامے کی توقع نہیں کی جا سکتی، وہ تھک کر بیٹھ جائے گا یا دو قدم چل

کر لوٹ آئے گا۔ مستی رفیقِ سفر ہو تو، لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دو قدم چل کر اور مشکلات کا اندازہ لگانے کے بعد لوٹنا عقل کا کام ہے۔ محبت کی مستی میں اٹھا ہوا قدم واپس نہیں لوٹتا۔ مستی کی فطرت ہی یہ ہے، کہ وہ آگے بڑھتی ہے، عقل کی طرح پسپائی اختیار نہیں کرتی۔ بدر و حنین کے مظاہر کیا تھے؟ کیا وہ عقل کی کارفرمائیاں تھیں؟ مصلحت اندیشیوں کے نتائج تھے؟ یہاں تو محبت کی وہی مستی کارفرما تھی، جو صحابہؓ کو مے خانۂ قدس سے ملی تھی۔ تیر کھا کر مرحبا کی صدائیں کیا خاکی قلب سے نکل رہی تھیں، جو معمولی سی چوٹ کھا کر تلملانے لگتا ہے، اور سپر انداختہ ہو جاتا ہے؟ یہ حضورؐ کی محبت ہی کی مستی تھی، جو زخموں سے چور ہو کر دعاگو بن گئی تھی، اور ان زخموں کی لذت پہ نثار ہو رہی تھی۔ جو اسے راہِ محبت میں پیش آ رہے تھے۔ دنیا میں بھی بعض لوگ عظیم کارنامے سرانجام دینے کے لیے شراب پیتے ہیں، اور بعض قومیں اپنے سپاہیوں کو کسی خطرناک محاذِ جنگ پر بھیجنے سے پہلے شراب کے ایک، دو جام پلا دیتی ہیں، تاکہ مستی میں تکلیف کا احساس نہ ہو۔

خدا تعالیٰ بھی اپنے کسی بندے کو مشکلات سے گزر کر رضا کی منزل پہ پہنچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے تو اسے اپنی محبت کا جام پلاتا ہے۔ محبت کی یہی مستی اسے ملامت سے بے نیاز کر دیتی ہے، تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیتی۔

مستی موجود ہو تو خطرات میں گھر جانا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ مستی نہ ہو تو معمولی حادثہ بھی جذبات کا نشہ اتار کر رکھ دیتا ہے۔

ایمان اور محبّت

تکمیلِ ایمان کے لیے تکمیلِ محبت ضروری ہے۔ ایمان کے خیابانوں میں اسی وقت بہار آتی ہے جب محبت صدیق بن جاتی ہے، محبت میں کھوٹ ہو تو ایمان میں کھوٹ ظاہر ہو کر رہے گا، اور محبت آلائشوں سے پاک ہو تو ایمان امتحانات کی آگ سے گزرنے کے بعد بھی کندن کی طرح چمکے گا، مصائب و آلام کی آندھیوں میں اسی ایمان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے، جس کی اساس محبت پر نہیں ہوتی۔ جس طرح جسم روح کے بغیر بیکار ہوتا ہے ہر وقت اس کے خراب ہونے کا احتمال رہتا ہے، ایسے ہی جو ایمان محبت سے خالی ہو نہ تو اس کی صورت ارتقا پذیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس سے ان صفات کا صدور ممکن ہوتا ہے۔ جو دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مردہ کیا ادائیں دکھا سکتا ہے، اور دلوں کو اپنی طرف کیا مائل کر سکتا ہے؟ یہ سب زندگی کی علامات ہوتی ہیں۔ زندگی اس ایمان میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جس کی احساس محبت پہ ہو۔ جو محبت کے سرچشمہ

سے فیض یاب ہو۔ جسم کی حیات مادی غذا پر منحصر ہے اور دل محبت سے
زندگی پاتا ہے! ایمان کا مقام دل ہے، دماغ نہیں۔ عقل تو اپنی ہی ادھیڑ
بن میں لگی رہتی ہے۔ وہ محبت کا مزا کیا چکھے گی؟ ایثار محبت کی فطرت ہے
عقل کی نہیں۔ عقل تو مفاد پرست ہوتی ہے۔ خود غرضی اس کی طینت
میں داخل ہے۔ اپنا گھر اجاڑ کر محبوب کا بول بالا کرنا محبت کا شیوہ ہے
محبت سب کچھ نثار کرنے کے بعد بھی راضی نہیں ہوتی۔ یہی چاہتی ہے
کہ ہزار جان ہوتی تو نثار کر دیتی اور عقل معمولی مفاد کی قربانی بھی نہیں کر سکتی
صحابہؓ کو سب کچھ نثار کرنے کے بعد بھی قربانی کی ہوس باقی رہتی تھی۔
تو اس کی یہ وجہ تھی کہ ان کے دل محبت سے سیراب تھے۔ محبت ازل سے
ایثار پیشہ ہے۔ ایثار ہی سے اسے زندگی ملتی اور ایثار ہی سے اسے سرمدی
ساعتیں نصیب ہوتی ہیں۔ ایثار کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ بلالؓ کی
زندگی اسی سوز و گداز میں تھی جو انہیں عشق رسول نے بخشا تھا، امیہ بن خلف
کے مظالم ان کی آتشِ ٹھنڈی نہ کر سکے، بلکہ ان کے عشق کی گرمی میں یہ صلاحیت
موجود تھی کہ امیہ کی بھڑکائی ہوئی آگ کو سرد کر دے، اس کی حرارت چھین
لے۔ محبت کی آگ ہی میں یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر آگ پہ غالب آسکتی
ہے۔ آتش نمرود کو گلزار بنا سکتی ہے۔ جسم اگر اثر پذیر ہو بھی تو احساسات گل و
گلزار بن کر مہکتے ہیں۔ قدرت بھی محبت ہی کے احترام کے لیے اپنے

قوانین بدل دیتی ہے۔ عقل کے احترام کے لیے کبھی کوئی قانون نہیں بدلا گیا۔ عقل کے لیے آتش نمرود کب گلزار بنی ہے؟ دریاؤں نے اسے کب راستہ دیا ہے اور صحراؤں کی وسعتیں اس کے قدموں کے نیچے سکڑی ہیں؟ محبت جب صحابہ رض کے روپ میں تسخیر کائنات کے لیے نکلی تو یہ سب کچھ ہوا، دریا بھی مسخر ہوئے اور پہاڑ بھی، دراصل یہ تسخیر صحابہ رض کی نہ تھی۔ ان کی اس محبت کی تھی جو ان کے سینوں میں موجزن تھی۔ جس ذات کے لیے ایثار کیا جائے اس کا اجر بھی اسی کے ذمہ ہوتا۔ صحابہ رض کی زندگی چونکہ سراسر ایثار تھی اس لیے جس ذات کے لیے وہ ایثار کرتے تھے ہر گام پہ اس کی نصرتیں ان کے ساتھ ہوتی تھیں، جب انسان کے اندر ایثار موجود نہ ہو، مفاد پرستی اور تن آسانی ہی اس کا شیوہ ہو تو اس کے لیے قوانین قدرت کیسے بدل سکتے ہیں۔ فرشتے آسمانوں سے نصرت و اعانت کے لیے کیسے اتر سکتے ہیں؟

فرشتوں کو آسمانوں سے زمین پہ کھینچ کر لانے کی قوت تو محبت میں ہے محبت نہ ہو تو خدا کی نصرت کیسی اور فرشتوں کا نزول کیسا؟

محرومی اور عطا

آج کا مقبول کل کا مردود ہو سکتا ہے اور کل کے مردود کو آج مقبولیت
عطا ہو سکتی ہے۔ سابقہ جب بے نیاز ذات سے ہو تو احتیاط کی ضرورت
ہوتی ہے۔ بعض غلاموں کو آقا کی نوازش گستاخ بنا دیتی ہے اور ان
کے اندر فساد کا مادہ پھوٹ پڑتا ہے اور بعض محبوب ہو کر زیادہ اطاعت
گزاری میں لگ جاتے ہیں کہ جن عنایات کی ہم پہ بارش ہو رہی ہے ہم
اس کے اہل نہ تھے۔ ایک کے لیے چشمِ کرم ہلاکتوں کا موجب بن جاتی
اور ایک مزید انعامات کا مستحق قرار پاتا ہے مقبولیت اور مردودیت کا تعلق
انسان کے اپنے گمان سے ہے۔ کسی ذات سے اچھا گمان قائم کر کے تعلقات
استوار کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک دن مقبولیت عطا ہو کر رہتی
ہے۔ حاتم طائی کو بھی بخیل جان کر نظر انداز کر دیا جائے تو محرومی کے سوا
کچھ حاصل نہیں ہوتا اور جو ذات تمام تر جود و کرم ہو، عطا و بخشش اس
کی عادت ہو، محروم لوٹانے سے زیادہ جسے بامراد لوٹانے میں مزا آتا ہو اس
کی بارگاہ سے تو محرومی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان اپنے اور حقیقی
معطی کے درمیان جو حجابات قائم کر لیتا ہے وہ اس کے اپنے پیدا کردہ

ہوتے ہیں۔ ورنہ کوئی کریم ذات جس کی فطرت عطا و بخشش ہو اپنے اور سائل کے درمیان حجاب کو پسند نہیں کرتی سخی کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے دروازے کشادہ رہنے سے اس کے ظرف میں اور وسعت پیدا ہوتی ہے گدا کے دامن کی وسعت اس کے جذبۂ سخا کو اور زیادہ ابھارتی ہے اور سخا پر آمادہ کرتی ہے۔ گدا اور سخی کے درمیان اگر کوئی خلیج حائل کر دی جائے تو وہ سخی کے احساسات کا تار تار ہلا کر رکھ دیتی ہے اور سخی اس خلیج کو عبور کر کے گدا تک پہنچنے کے لیے بے قرار رہنے لگتا ہے۔ ہر کمال اظہار کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ پھول کے دل میں یہ آرزو چھپی ہوتی ہے کہ دنیا اس کا جمال دیکھے۔ اس کی نکہتوں سے کیف گیر ہو۔ آفتاب کی خوشی مستور رہنے میں نہیں بے حجابی میں ہے۔ دنیا کو اپنے نور سے منور کرنے میں ہے۔ سخی بھی اپنے جذبۂ سخا کی نمود چاہتا ہے۔ اسی لیے دنیا کو اپنے نور سے نوازنے والے کریم نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ دنیا کے سخیوں سے بار بار مانگا جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں ممکن ہیں ایسا کریم ہوں کہ مجھ سے نہ مانگا جائے تو مجھے قلق ہوتا ہے۔ سائل کے بار بار تقاضے سے دنیا کے سخیوں کو اپنے خزانے کے کم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن بحر و بر کو اپنے خوان سے سیراب کرنے والے سخی کے خزانے کے کم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ وہ خود محدود ہیں اس لیے ان کی عطا بھی محدود ہے اور ظرف بھی محدود، لامحدود وسعتیں رکھنے

والے خزانوں کے مالک کا ظرف بھی لامحدود ہے اور بخشش و عطا کا جذبہ بھی
لامحدود۔ ذلتیں تو ان سائلوں کے مقدر میں ہوتی ہیں جو کریم کو چھوڑ کر
بخیل کے دروازے پر دستک دینے لگتے ہیں۔ لامحدود ذات کو چھوڑ کر محدود
کے دستِ کرم کو حاجت روا سمجھنے لگتے ہیں۔ اعلیٰ بارگاہ سے وابستہ ہونے
والے فقیر بھی بے نیاز ہوتے ہیں۔ بارگاہ جتنی اونچی ہوگی بے نیازی کی
شان بھی اسی نسبت سے عطا ہوگی۔

خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں میں بے نیازی کی جو شان پیدا ہو جاتی
ہے اس کا باعث بھی یہی ہے کہ ان کا تعلق بے نیاز ذات سے ہو جاتا ہے
وہ اسی کو اپنے لیے کافی سمجھ لیتے ہیں اور وہ ان کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔
کسی بادشاہ کا غلام اگر بازار میں بھیک مانگتا نظر آجائے تو وہ کشتنی قرار
پاتا ہے۔ شاہ کی غیرت جوش میں آجاتی ہے کہ ہماری بارگاہ سے وابستہ
ہونے کے بعد یہ بھیک مانگ رہا ہے؟ ہماری آبرو خاک میں ملا رہا ہے؟
بندہ بھی جب غیروں کے سامنے دامن پھیلاتا ہے تو مالک حقیقی کی غیرت
جوش میں آجاتی ہے کہ ہمارا کہلا کر یہ کمینگی! یہ رذالت؟ اور پھر ایسے بندے
کو انہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے جو اس سے نہایت سنگدلانہ سلوک
کرتے ہیں۔

عتاب اور کرم

انسان سراسر احتیاج ہے اور خدا غنی جہاں بھی غنا کی شان نظر آتی ہے، سب اسی کے غنا کا پرتو اور عکسِ جمیل ہے۔ ماہ و نجوم کا نور ذاتی نہیں سورج کا عطا کردہ ہے، چشمۂ آفتاب کا فیضان ہے ایسے ہی بندے میں جو بھی خوبی ہے، وہ اسی قادر و قیوم ذات کی عطاؤ بخشش کا فیضان کہلائے گی جس نے ستاروں کو نور آفتاب و ماہتاب کو دل آویزیاں، پہاڑوں کو جبروت، درختوں کو ایستادگی، سبزے کو شادابی اور دریاؤں کو روانی بخشی ہے۔ خوبی خواہ کسی بھی نوعیت کی ہو، وہ کسی کی ذاتی نہیں کہلا سکتی۔ گدا منعم کے دروازے سے خواہ کتنی وافر مقدار میں بھیک حاصل کرلے۔ گدا ہی ہے گا اور گدا کہلائے گا۔ گدا بہر حال منعم کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا۔ منعم سب کچھ لٹانے کے بعد بھی منعم ہی رہتا ہے اور گدا سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی گدائی کے رتبے سے بلند نہیں ہو سکتا۔

بندگی کی شان گدائی میں ہے منعم حقیقی کی ہمسری کا ہلکا سا خیال بھی آجانے اور اس کی بارگاہ سے نیاز مندی کا رشتہ قطع کر لینے کے تصور

سے انسان فرعون کا مثیل بن جاتا ہے۔ تباہی اور بربادی اس کے گرد منڈلانے لگتی ہے اور انجام کار اس کا حشر بھی وہی ہوتا ہے جو فرعون کا ہوا تھا۔ ڈھیل نجات کی دلیل نہیں ہوتی، بلکہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ فرعون نے مدتوں خدائی کے جھوٹے دعوے کیے تھے اور خدا کے بندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ لیکن جب وقتِ موعود آگیا، تو کوئی چیز اسے ہلاکت سے نہ بچا سکی۔ منعم کی بارگاہ سے فیضیاب ہونے کے بعد گدا کے ذمے شکر ہوتا ہے اور شکر عافیت کی دلیل کہلاتا ہے۔ ممنون ہونے والا گدا منعم کی مزید نوازشوں کا مستحق بن کر رہتا ہے، اس کی طرف خود بخود دستِ کرم اٹھنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر منعم کو گدا سے محبت ہوتی ہے جیسے آئینہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور سخی کے لیے گدا کی صورت آئینہ بن جاتی ہے، وہ اس میں اپنے سخا کے حسن کو دیکھتا ہے تو نثار ہونے لگتا ہے اس کی یہ محبت دراصل اپنی ہی ایک صفت سے محبت ہوتی ہے۔ گدا چونکہ سخی کے جذبۂ رحم و کرم کا مظہر بن کر سامنے آتا ہے، اسی لیے اسے محبوب نظر آنے لگتا ہے، جو بندے خدا تعالیٰ کی صفات کا آئینہ بن جاتے ہیں، وہ نگاہِ فطرت میں اسی لیے محبوب ہوتے ہیں کہ قدرت ان میں اپنا ہی حسن و جمال دیکھتی ہے، اپنی ہی صفات کو آشکارا پاتی ہے تو انہیں اپنے قریب

کر لیتی ہے، اپنے قرب سے نوازتی ہے۔ اپنے حسن کے آئینے کا ٹوٹنا اور گرد آلود ہونا کسی حسین کو گوارا نہیں ہوتا۔ آئینہ حسن کا مظہر بن جاتا ہے تو ٹھوکروں سے محفوظ ہو جاتا ہے، گرد و غبار اس کے قریب نہیں پھٹکنے پاتا۔ حسن کے ہاتھ خود اس کی صفائی کرتے ہیں۔ اسے گرد و غبار سے محفوظ رکھنے کے لیے تا حدِ امکان کوششیں کی جاتی ہیں۔ بندہ بھی حسنِ فطرت کا آئینہ بن جانے کے بعد خدا کی پناہ میں آجاتا ہے خدا ہی اس کا محافظ و نگران ہوتا ہے اور خدا ہی اس کی مدد کے لیے غیب سے سامان پیدا کرتا ہے۔ گدا کی فطرت کیسی ہوتی ہے جب وہ کسی ذات کو اپنی آرزوؤں کا ملجا و ماویٰ قرار دے لیتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس بارگاہ سے مراد مل کر رہے گی تو وہ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ تاخیر اس کے عزائم میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہی وہ ان ناگواریوں کو خاطر میں لاتا ہے، جو انتظار کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ اس یقین سے اس کا سینہ معمور ہوتا ہے کہ جب دروازہ کھلا، جاں کاہیوں کی قیمت وصول ہو جائے گی۔ ایسے یقین کی دولت سے بہرور گدا محروم نہیں رہتے۔ سخی کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ طویل مدت سے دروازے پر پڑا انتظار کی زحمت برداشت کر رہا ہے، تو اس کے احساسات کا تار تار جھنجھنا اٹھتا ہے۔ اتنا عطا کر دیتا ہے کہ اسے تنگیٔ داماں کی شکایت ہونے

لگتی ہے اس نوعیت کی بھیک کے مستحق صرف وہی گدا قرار پاتے ہیں جنہیں سخی کے کرم پر کامل اعتماد ہوتا ہے۔ تاخیر ان میں مایوسی پیدا نہیں کر سکتی جو نسبت انہیں سخی کی ذات سے قائم ہوتی ہے وہ کسی صورت میں ٹوٹنے نہیں پاتی۔ جو گدا عجز کا سرمایہ لے کر آنے کی بجائے کبر و غرور کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور آواز میں سوز پیدا کرنے کی بجائے استحقاق جتاتے ہیں لطف و کرم کا مورد نہیں بنتے، لطف و کرم تو حصہ ہی نیاز مندوں کا ہے جو خود بخود ان کی جھولی میں آگر رہتا ہے۔ بارگاہِ صمدیت سے مانگنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ انسان کا دل اپنی بے مائیگی کے احساس سے لبریز ہو، اسی کو قادرِ مطلق اور نجات دہندہ سمجھے۔ بے کسی کا احساس جب حد سے فزوں ہو جاتا ہے اور نظریں اسی کی بارگاہِ جمال پر مرکوز رہنے لگتی ہیں تو سوز کی تاثیر سے لبریز دل اور خشیت ربانی سے اشک بار آنکھوں کا عطیہ ملتا ہے، گھن گرج بارش کے آنے کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور درد کی تاثیر سے لبریز دل اور برسنے والی آنکھیں رحمتِ الٰہی کی آمد کی علامت کہلاتی ہیں۔ آنسو گرتے ہیں تو غیب سے آنسو پونچھنے والا ہاتھ بھی نمودار ہو جاتا ہے۔ مضطر دل کی کون دلجوئی کرتا ہے اور ان کے غم میں شریک ہونے کی تڑپ کس دل میں پیدا ہوتی ہے؟

محبت کے خیابان

بندہ جب مشیتِ ربانی کے تابع ہو جاتا ہے تو یہی نہیں کہ اس کی حیات سنور جاتی ہے اور اسے امن حاصل ہو جاتا ہے بلکہ وہ اپنے لیے ذخیرۂ آخرت بھی فراہم کر لیتا ہے۔ فساد تو وہاں آکر پھوٹتا ہے۔ جب بندہ خواہشات کا پشتارہ لے کر مشیت کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور اپنا ایک ایک مطالبہ منوانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ غلام اسی کو راحت نصیب ہو سکتی ہے۔ جو آقا کی مشیت میں ڈھل جاتا ہے۔ اپنی خواہشات پر مالک کی خواہشات کو مقدم جانے جو غلام آقا کو اپنی مرضی کا پابند بنانا چاہے، اپنا ہر مطالبہ اس سے منوانے کی کوشش کرے، اسے کبھی راحت نصیب نہیں ہوتی۔ راحت آقا کو اپنی مرضی کے تابع بنانے کی کوشش میں نہیں، اس کے مزاج میں ڈھل جانے میں ہے۔ ایسا غلام اگر ایاز بھی ہو تو محمود بن کر رہتا ہے۔ محبوبیت اسے مل کر رہتی ہے محبوبیت نافرمانوں کو نہیں ملتی یہ اطاعت گزاروں کا حصہ ہے۔

بندہ بھی جب اپنے تمام امور خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے،

اس کی مشیت کا غلام بن جاتا ہے اور اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا خدا کے لیے ہو جاتا ہے تو اسے بارگاہِ صمدیت سے قبولیت کی سند ملتی ہے۔ جب ربانی احکام کو اپنی عقل کی میزان میں تولنے کا خوگر ہو جاتا ہے اور اس کی مشیت میں دخل اندازی کرنے لگتا ہے تو مردودِ بارگاہ قرار پاتا ہے۔ ایسے غلام کو کبھی آسودہ حال اور مطمئن نہیں دیکھا گیا جو آقا کے ہر حکم کو اپنی عقل کی میزان میں تولنے کا خوگر ہو، اطاعت کے لیے یہ شرط قرار دے کہ وہی حکم مانوں گا جو میری عقل کی میزان میں پورا اترے، میری خواہشات کے مطابق ہو۔ ایسے انسان کو کوئی معمولی درجے کا انسان بھی اپنی ملازمت میں رکھنے کے لیے تیار نہ ہو گا۔ اختیار کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اطاعت اور فرمانبرداری چاہتا ہے۔ کوئی بااختیار ذات اپنے ملازم کے سامنے جھکنا گوارا نہیں کرتی تو اس قادر و قیوم ذات سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے نظام میں بندوں کی خواہشات کی پابند ہو گی! وہ تو لامحدود اختیارات کی مالک ہے، سمیع اور بصیر ہے، بے نیاز ہے اسے منانے کی تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ اس کی کبریائی کو تسلیم کر لیا جائے۔ غیر مشروط طور پر اس کی اطاعت قبول کر لی جائے۔ ایاز، محمود کے ہاتھ سے کڑوا خربوزہ لے کر بھی کھاتا ہے اور اس کی کڑواہٹ کی شکایت کرنے کی بجائے یہ کہہ کر فرحت و شادمانی کا اظہار کرنے لگتا ہے کہ جس ہاتھ سے ہمیشہ میٹھی چیزیں

ملی ہیں، جن ہاتھوں نے شانہ بن کر ماں کی طرح میری زلفوں کو سنوارا ہے اسی ہاتھ سے اگر ایک کڑوی چیز مل گئی تو شکایت کیسی؟ تو اس کی یہی ادا اسے قرب کے نئے مرتبے پر فائز کر دیتی ہے۔

مراتب کی بلندی اہلِ محبت کا حصہ ہے۔ شکر گذار بندوں کو اس نعمت سے نوازا جاتا ہے۔ عقل کے اسلحہ خانہ سے نئے نئے ہتھیار نکال کر الجھنے والوں اور دلیل کے چکروں میں پڑنے والوں کو قرب کی منزل کے قریب کون پھٹکنے دیتا ہے؟ قرب کی منزل کے راز و نیاز اور ہم آغوشی کی لذتیں تو رضا کے بندوں کو ملتی ہیں۔

محبت دوست کے ہاتھ سے کڑوی چیز لے کر بھی خوش ہو جاتی ہے اور ہوس نعمت پانے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوتی۔ اسے نعمت میں بھی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ کبھی اس کی کمی کی شکایت کرتی ہے اور کبھی دوسروں کو دیکھ کر قلق و اضطراب کا اظہار کرنے لگتی ہے کہ مجھے ان پر فائق کیوں نہیں کیا گیا ہوس کے دل میں چونکہ اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے، اس لیے وہ ہر حال میں دوسروں پر فائق ہونا چاہتی ہے اور محبت چونکہ بے اختیار ہوتی ہے بے اختیاری اس کی فطرت میں داخل ہے، اپنے اختیارات کی نفی کرنے کے بعد وہ محبوب کے اختیارات کی بلندی تسلیم کرانے کی تگ و دو میں مصروف رہتی ہے، اس لیے محبوب کی بارگاہ میں اسے اپنا کوئی حق نظر نہیں آتا، ہر

عنوان وہ محبوب ہی کو بلند و بالا دیکھنا چاہتی ہے، اس کے اختیارات دیکھ کر اسے مسرت ہوتی ہے، اس لیے وہ ہر حال میں راضی رہتی ہے۔ عقل اپنے اختیارات منوا کر خوش ہوتی ہے اور محبت بے اختیار بن کر معراجِ کمال حاصل کرتی ہے۔ ایک کی ساری تگ و دو خود کو منوانے کے لیے ہوتی ہے اور اس میں وہ اپنی عمر صرف کر دیتی ہے اور ایک محبوب کی بارگاہ میں حیات کا سرمایہ لے کر اس لیے حاضر ہوتی ہے کہ اس کا بول بالا ہو۔

خُدا کا قانون

گلی کوچوں میں بکھری ہوئی غلاظتیں کسی معاشرے کی صحت مندی کی علامت نہیں ہوتیں، محکمہ حفظانِ صحت اگر فرض شناس ہو تو پورے شہر کی فضا صاف ستھری نظر آتی ہے، نہ ہی کہیں غلاظت دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی عفونت سے دل و دماغ پریشان ہوتے ہیں۔ کھلی فضا میں اسی وقت دم گھٹتا ہے جب چاروں طرف غلاظتوں کے انبار پڑے ہوں۔ فسق و فجور کی گرم بازاری۔ گناہوں کی کثرت اور معاصی اور طغیان کی فراوانی کسی نظامِ کار کی بہتری کا ثبوت نہیں ہوتی۔ باطل کو اسی وقت فروغ حاصل ہوتا ہے جب حق کے ارتقاد پذیر ہونے کے تمام راستے مسدود ہو

جائیں۔ جب نظامِ کار خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کے ہاتھ میں ہو جن کے دل حق پرستی کے جذبات سے مملو ہوں تو حق کو فروغ حاصل ہو کر رہتا ہے باطل کو سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔

آفتاب کا وجود ظلمتوں کے لیے پیامِ موت کی حیثیت رکھتا ہے یہ ناممکن ہے کہ آفتاب درخشاں اور تاباں ہو، اور ظلمتیں پھیل رہی ہوں چاروں طرف ان کی کارفرمائی ہو۔ اور تاریکیوں میں کچھ دکھائی نہ دے؟ آفتاب کا وجود تو پوری کائنات کے لیے نور کا پیام ثابت ہوتا ہے اس کی طلعتیں کسی محدود حلقے تک محدود نہیں رہتیں۔ ہر ذرۂ ممکنات اس کی تابانیوں سے مستنیر نظر آتا ہے۔ بھلائی اور نیکی کا وجود بھی آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے نیکی پھیلانے کی قوت جب بھی خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کے ہاتھ میں آئی ہے، پوری کائنات نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ زخمی دلوں نے راحت محسوس کی ہے۔ بے سہاروں کو سہارا ملا ہے۔ بے یاروں کی فریاد سنی گئی ہے۔ اور کسی مظلوم کے آنسو بیکار نہیں گئے۔ انہیں ان کی قیمت ملی ہے انسانیت کے چہرے سے شرافت کی نقاب صرف اسی وقت نوچی گئی ہے جب مظلوموں کی فریاد سننے والا کوئی نہیں رہا حق پرستی کے جذبات کی جگہ باطل پرستی نے لے لی ہے۔

ظلم وجور اور شقاوت نے جب بھی کسی حجاج بن یوسف کا روپ

دھار کر علم اٹھایا ہے، تو اس کے عہد کے حسن بصریؒ کا دل دو نیم ہوا ہے۔ اس کی مظلومیت پر قدسیوں نے آنسو بہائے ہیں۔ کروبین اس کے غم میں سوگوار ہوئے ہیں۔ اور دلِ یزداں بسمل کی طرح تڑپا ہے۔ "اپنوں کے غم میں کون پریشان نہیں ہوتا۔ اور اپنوں کی موت پر کس کے آنسو نہیں بہتے؟ انسان جب مظلوم اور مقہور ہوتا ہے زخموں سے نڈھال ہو کر دو قدم چلنے کی سکت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور اس پہ زندگی کی راہیں مسدود نظر آنے لگتی ہیں، اسے ظلمتوں میں کچھ سجھائی نہیں دیتا، تو اس کا شکستہ دل تجلی گاہ دوست بن جاتا ہے، تسکین بن کر دوست خود سہارا دینے آتا ہے۔ اس وقت اس کے آنسوؤں میں بلا کی تاثیر ہوتی ہے، اس کی کراہیں عرش معلےٰ کا دل ہلا دیتی ہیں۔ اور اس کے زخمی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی فریاد سننے کے لیے اجابت عرش معلےٰ سے دوڑتی ہوئی آ کر اس سے بغل گیر ہو جاتی ہے۔ ایسے انسانوں سے جنگ خدا سے جنگ ہوتی ہے۔ ایسوں کی مخالفت خدا کی مخالفت کہلاتی ہے۔

حسن بصریؒ کے چہرے پہ ڈھلکتے ہوئے آنسو، حجاج کی تباہی کا پیش خیمہ تھے۔ اور سجادؑ کے پاؤں کی زنجیر اور گلے کے طوق کا ہر حلقہ فریاد و فغاں کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ فریاد و فغاں کیسے رائیگاں جاتی؟ اپنا اثر دکھا کر رہی۔

حق کو جو لوگ قوت کے ذریعے دبانے کا عزم لے کر اٹھتے ہیں وہ اگر ہنگامی طور پر کامیاب بھی ہو جائیں تو یہ کامیابیاں ہمیشہ ان کا ساتھ نہیں دیتیں، حق کو پھر غلبہ نصیب ہوتا ہے اور باطل مٹ کر رہتا ہے یہ قانونِ قدرت ہے۔ اور اس میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔

گدا اور غنی

بارانِ رحمت کا نزول مردہ زمین کو زندگی عطا کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ باغ و بوستان تک ہی محدود نہیں رہتا۔ ہر خطۂ زمین کو نئی زندگی ملتی ہے خواہ وہ بنجر ہی کیوں نہ ہو۔ بنجر زمین میں بھی روئیدگی کے آثار پائے جاتے ہیں

خدا تعالیٰ کے نیک اور پاک انسانوں کی زندگی بھی بارانِ رحمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا سحابِ کرم جب برستا ہے تو دشت وجبل کو سیراب کرتا ہے۔ ہر روح میں نیکی کی طلب پیدا ہونے لگتی ہے، اور بدی سے خود بخود دل نفور ہونے لگتے ہیں۔ چمنستانوں اور خیابانوں کی دلکشی اس امر کا ثبوت ہوتی ہے کہ ادھر سے کاروانِ بہار گذرا ہے۔ یہاں کھل کر ابرِ کرم برسا ہے۔ بنجر زمین پر بھی روئیدگی کے آثار بارانِ رحمت کا ثبوت ہوتے ہیں۔ غرض رحمت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس کے بادل جب

بھی برستے ہیں، کسی کو محروم نہیں رکھتے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہار میں کسی کا
دامن پھولوں سے بھر جاتا ہے، اور کسی کے حصے میں چند تنکے آتے ہیں۔
یہ اپنی اپنی استعداد ہے۔ اپنی اپنی قابلیت ہے کسی کے مقدر میں بہار کی
شادابیاں ہوتی ہیں۔ اور کسی کے مقدر میں چند تنکے۔ فطرت کا فیضان
ازل سے جاری ہے، اور ابد تک جاری رہے گا۔ آسمان سے گرنے
والی ہر بوند کے مقدر میں موتی بننا نہیں ہوتا۔ موتی وہی بوند بنتی ہے جس
کے لیے صدف کا منہ کھلا ہو۔ سیپ اسے پیٹ میں لے کر سمندر کی گہرائی
میں اتر جائے۔ مدتوں کی قید بوند کو موتی کی صورت میں ڈھال دیتی ہے
اسے چمک دمک عطا کرتی ہے اور اسی کو سرفرازیاں ملتی ہیں۔ شاہوں
کے تاج کی زینت اسی کو بننا نصیب ہوتا ہے حسین گلے میں آویزاں ہونے
کی سعادت اسی کے حصے میں آتی ہے۔ بادلوں میں نہ ہی پھول کھلتے ہیں،
اور نہ ہی بہاریں مسکراتی ہیں۔ وہاں تو صرف جلا دینے والی بجلیاں ہوتی
ہیں، بہاریں شادابیاں، رنگینیاں اور رعنائیاں صرف زمین کا حصہ ہیں۔
یہ اسی بوند کو ملتی ہیں جو بلندیوں سے اتر کر زمین کے پیٹ میں پہنچ جاتی ہے
زمین سے پھوٹ کر نکلتی ہے تو گل و گلزار کہلاتی ہے۔ سیپ کے پیٹ
سے باہر آتی ہے تو اسے آبدار موتی کہا جاتا ہے۔ فیضان یہ سب بارانِ
رحمت ہی کا ہوتا ہے۔ نام جدا جدا ہیں۔ جو جس رنگ میں بھی بارانِ رحمت

سے اکتسابِ فیض کرے، اسے فیض پہنچتا ہے، اور اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ بارانِ رحمت کے نزول کے وقت کوئی سیپ منہ نہ کھولے تو وہ موتی کو کیا آغوش میں لے گی؟ بوند سیپ کے پیٹ میں اترنا پسند نہ کرے تو اسے کیا چمک دمک عطا ہو گی؟ جس کا جتنا ظرف ہو، وہ رحمت سے مستفیض ہوتا ہے۔ فطرت بخیل نہیں۔ رحمت کا خاصہ کشادہ ظرفی ہے، نوازنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ بشرطیکہ کوئی استفادے کے لیے تیار ہو، رحمت کے بادلوں کو منڈلاتا دیکھے تو دامن پھیلا دے۔ دامن موتیوں سے لبریز نہ ہو گا، تو پھول ضرور عطا ہوں گے۔ عطا و بخشش کرنے والی ذات کسی کو محروم دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ عطا وہیں ہوتی ہے، جہاں غنا ہو، اور ہر غنی ذات میں بے نیازی بھی ہوتی ہے، اسے اپنی طلب کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ پابندی محتاج کا خاصہ ہے۔ غنی میں پابندی نہیں ہوتی۔ وہاں تو سراسر غنا ہی غنا ہوتا ہے۔ بے نیازی ہی بے نیازی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے تو دامن پھیلانا ہی پڑتا ہے۔ اپنی احتیاج کا اظہار کرنا ہی پڑتا ہے۔

دعا بھی اعترافِ عبودیت کی ایک صورت ہے۔ اس سے احتیاج کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنی محتاجی ظاہر ہوتی ہے، اسی لیے اعترافِ بندگی کے لیے دعا ضروری ہے۔ یہ اعتراف جتنی کامل صورت میں ہو گا، اسی قدر جتنا یا

کا مستحق قرار پائے گا۔ گدا کی فطرت کمینی ہوتی ہے وہ سخی کی بے نیازی سے
مایوس نہیں ہوتا۔ خوئے گدائی ترک نہیں کرتا اور انجام کار مراد کو پہنچتا
ہے۔ خوئے گدائی ہی اس کی کامیابیوں کی ضامن ہوتی ہے۔

جزا اور سزا

جو لوگ سفر اختیار کرنے سے پہلے ضروریاتِ زندگی کا سامان فراہم
کر لیتے ہیں ان کا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے راہ کی مشکلات انہیں
پریشان کرتی ہیں جو زادِ سفر سے بے نیاز ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے
ہیں نہ ہی راہ کی مشکلات کا اندازہ لگا کر سامان فراہم کرتے ہیں اور نہ ہی
منزل کا تعین کرنے میں بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ منزل پہ پہنچنے کے
لیے سمتِ سفر کا تعین بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری ہوتا ہے
کہ سفر کا آغاز مناسب وقت پر کیا جائے۔ صبح سویرے سفر اختیار کرنے والے
تمازتِ آفتاب سے بچ جاتے ہیں۔ دھوپ کی شدت انہیں پریشان نہیں
کرتی اور منزل پہ پہنچنے کے بعد ان پہ واماندگی طاری نہیں ہوتی جو مسافر
کو منزل کے حسن و جمال اور اس کے مسحور کن مناظر کی دلفریبیوں سے
لطف اندوز ہونے سے محروم کر دیتی ہے عقبیٰ کی منزل کا مسافر بھی صبح

سفر اختیار کر لیتا ہے۔ تو اس کا سفر آسان ہو جاتا ہے، تیز دھوپ اور لو کے تھپیڑوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ سفر جس نوعیت کا ہو، سامان بھی اسی کی نسبت سے درکار ہوتا ہے۔ صحراؤں اور ریگستانوں میں سفر کرنے والے مسافر کا رختِ سفر شاداب۔ وادیوں اور بہار آفریں آبادیوں میں سفر کرنے والے انسان کے رختِ سفر سے مختلف ہوتا ہے۔ صحرا کی ضرورتیں آبادیوں کی ضرورتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح عقبیٰ کی منزل کے مسافر کا رختِ سفر دنیا کے مسافر کے رختِ سفر سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ دنیا کے مسافر کو دنیوی ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں مال و دولت اور ساز و سامان کام دیتے ہیں اور آخرت کی منزل پر پہنچنے کے لیے اعمالِ صالح کی ضرورت ہے۔ نزع میں بھی اعمال تسکین بخشتے ہیں۔ قبر میں بھی ان کی روشنی قبر کے اندھیروں کو نور میں تبدیل کر دیتی ہے اور حشر کے میدان میں بھی ان کی موجودگی رحمتوں اور سرفرازیوں کا موجب ثابت ہوگی۔ آفتابِ قیامت اپنی تمام تر شرربازیوں کے باوجود دامن میں اعمالِ صالحہ کا اثاثہ رکھنے والوں کو پریشان نہیں کر سکتا یہ لوگ رحمت کے سایہ میں ہوں گے، رحمت ہی ان کی انیس ہوگی اور رحمت ہی مونس و دمساز۔ دنیا کا مال و متاع صرف دنیا کی راہوں میں کام آ سکتا ہے لیکن آخرت کے لیے جو اثاثہ فراہم کیا جاتا ہے وہ دنیا کے سفر کو بھی آسان بنا دیتا ہے اور عقبیٰ میں بھی راحتوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

عقبےٰ کی تسکین کیا ہے؟ انسان کے اعمال صالحہ جو لوگ خدا کی مشیت کے تابع رہ کر سر انجام دیتے ہیں عمل کوئی بھی ضائع نہیں جاتا، خواہ نیک ہو یا بد، اچھا ہو یا بُرا، خیر ہو یا شر، ثواب ہو یا گناہ۔ رنج اور راحت انہی اعمال کے مختلف مظاہر ہیں، مختلف صورتیں ہیں اور یہی صورتیں انسان کو پیش آتی رہتی ہیں۔ یہاں بھی اور وہاں بھی، دنیا میں بھی اور عقبےٰ میں بھی، ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی غیب و شہود کی دنیا پر فرماں روائی کرنے والی قادر و قیوم ذات دونوں جہان میں انسان کو اس کے اعمال کی جزا دیتی ہے۔ جیسے اعمال ہوں گے، ویسی جزا متشکل ہو کر سامنے آئے گی۔ نیک انسانوں کے اعمال جہنم کے شعلے بن کر ان کے جسموں کو نہیں لپٹ سکیں گے اور بدوں کے اعمال جنت کی شادابیوں کی صورت اختیار نہیں کر سکتے۔ سامنے وہی آئے گا جو کسب کیا ہو گا اور جو اثاثہ فراہم کرنے میں زندگی صرف کی ہو گی۔

رضا کی وادی

بعض گناہ قرب خداوندی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور بعض نیکیاں انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہیں جس گناہ کے بعد انسان میں عجز پیدا ہو اور اس کے احساس کی تلخی، ندامت کا آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگے اور بندے کو اپنے مولا کی طرف رجوع کر دے وہ اس نیکی سے افضل ہوتا ہے جو بندے میں کبر و غرور پیدا کرنے کا موجب ثابت ہو۔ بارگاہِ حق میں قبولیت کا درجہ حاصل کرنے والی چیز کبر و غرور نہیں بلکہ بندگی کا وہ احساس ہے جو تمام تر عبودیت اور شکستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

کوئی چیز خدا تعالےٰ نے اس کائنات میں عبث اور بے فائدہ پیدا نہیں کی حق تو خیر حق ہی ہے، باطل کا وجود بھی بے فائدہ نہیں۔ انسان جب شیطانی قوتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے تو اس کی ان صلاحیتوں کو انگیخت ہوتی ہے جو حق کی نصرت و اعانت کے لیے اس کے اندر موجود ہوتی ہیں باطل کا وجود نہ ہو تو حق کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا موقع نہ مل سکے۔ ہر نبی جو قدرت کا پیغام لے کر مبعوث ہوا ہے اسے باطل کی قوتوں سے ٹکرانا پڑا ہے۔ نبی جس قدر ذی شان اور عظمت والا ہوا ہے، باطل بھی

اسی نسبت سے اس کے سامنے آیا ہے۔ ہمارے حضورؐ چونکہ سید الانبیا تھے۔ اسی لیے حضورؐ کو باطل کی عظیم قوتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ حضورؐ خود فرماتے ہیں کہ جس قدر میں ستایا گیا ہوں کوئی نبی نہیں ستایا گیا۔ حضورؐ کی اُمت میں سے جو لوگ عظیم الشان ہوئے ہیں، انہیں باطل کی عظیم قوتوں سے ٹکرانا پڑا ہے اور اسی طرح ان کی عظمتیں آشکارا ہوئی ہیں۔ ان کی صلاحیتیں بروئے کار آئی ہیں اور زمانے ان کی عظمتوں کا لوہا مانا ہے۔

جو انسان خدا تعالیٰ کے مقرب اور پسندیدہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی راہ کا ہر کانٹا خود بخود دور ہو جائے اور اسے ہاتھ ہلانے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے، وہ غلط آرزو ہے کہ رضا کی وادی میں آیا ہے۔ رضا کی وادی پھولوں کی سیج نہیں، یہاں قدم قدم پر خار دار جھاڑیاں ہیں۔ جو دامن سے الجھتے ہیں۔ راستہ روکتے ہیں، اور انسان اور اس کی منزل میں حدِ فاصل بن کر اسے منزل سے باز رکھنے کے لیے لپکتے ہیں، کامیاب انسان وہی ہے جو ان مشکلات پر عبور حاصل کرے۔ رضا کی منزل کی راہ میں پڑے ہوئے کانٹوں کو پلکوں سے چننے کا حوصلہ لے کر آگے بڑھے۔ اور ان مشکلات کو خاطر میں نہ لائے جو اس کی راہ میں حائل ہوں، تھکے ماندے مسافر کو منزل کی راحتیں جو مزہ دیتی ہیں، وہ اس مسافر کے سرور و سکون سے یکسر مختلف ہوتی ہیں جیسے کوئی

حادثہ واصل منزل سے کر دے۔ ایسا مسافر نہ منزل کی حقیقی راحتوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے نہ ہی اس کی نگاہ ہیں ان راحتوں کی کوئی قدر و منزلت ہوتی ہے۔

وہ انسان خدا تعالیٰ کی رضا کے مفہوم کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کے بدن پر کبھی کوئی خراش نہ آئی ہو جس نے خدا کے لیے احساسات کی قربانی نہ دی ہو اور اس کی آرزوئیں اور تمنائیں پامال نہ ہوئی ہوں۔ جذبات اور احساسات کی قربانی کے بعد ہی انسان پر رضا کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ رضا کی منزل کا حسن بے نقاب ہو کر اس کے دیدۂ دل کو نئی زندگی عطا کرتا ہے۔

دِل کی زندگی

دل کی بیداری زندگی ہے اور غفلت موت دل کو یادِ الٰہی سے زندگی ملتی ہے غافل انسان نہ خود زندگی کا لطف اٹھا سکتا ہے اور نہ دوسروں کو زندگی عطا کر سکتا ہے۔

بیداری میں اپنے نفع اور نقصان کا احساس بھی ہوتا ہے اور دوسروں کی بھلائی سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں ہوتی۔ درخت اسی وقت

تک سرسبز و شاداب رہتا ہے جب تک اس کی جڑیں زمین میں پیوست رہتی ہیں۔ زمین ہی سے اس کی نمود ہوتی ہے۔ زمین ہی سے نکل کر وہ اپنی بہار دکھاتا ہے، پھلوں، پھولوں، شاخوں اور پتوں کا مالک بنتا ہے۔ حیات ملنے کے بعد بھی وہ زمین کی احتیاج سے بے نیاز نہیں ہو جاتا اپنی اصل سے کٹ کر کوئی چیز زندہ نہیں رہتی۔ انسان بھی دل یزداں سے پھوٹ کر نکلنے والی تجلی کا دوسرا نام ہے۔ اس کی اصل سرمدی وجود ہے۔ یہ اسی ذات کا فیضان ہے جسے فنا نہیں اس کی حیات بھی اسی وقت تک بہار آفرین رہتی ہے جب تک اس کا رشتہ اپنی اصل سے قائم رہتا ہے۔ نفس کی آمد و شد کا نام زندگی نہیں۔ اپنی اصل سے واصل ہونے کے لیے جو زندگی درکار ہوتی ہے وہ شعور ہی کی زندگی ہے جس میں انسان پر غفلت طاری نہ ہو۔ وجدان و شعور زندہ ہوں، ورنہ کھاتے پیتے تو کافر بھی ہیں۔ انہیں چونکہ دل کی بیداری نصیب نہیں ہوتی، اس لیے خدا نے انہیں مُردہ کہا ہے۔ مُردہ، حیات کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتا حیات کی حقیقتوں کو سمجھنا اور ان سے کیف و گیر ہونا زندگی کا فعل ہے۔ زندگی عطا کرنے کے بعد خدا چھینتا نہیں۔ یہ انسان کے اپنے افعال ہیں جو اسے زندوں کی صف سے نکال کر مردہ لاشوں میں لا ڈالتے ہیں۔ حیات سے محروم ہونے کے بعد انسان احساس کی دولت سے

محروم ہوجاتا ہے۔ احساس زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ انسانی حیات بھی جب دل کی زندگی سے محروم ہوجاتی ہے تو وہ نہ خیر کو پہچانتی ہے نہ شر کو۔ گناہ و ثواب اس کے نزدیک مساوی ہوجاتے ہیں۔ جائز و ناجائز کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ بلکہ جب انسان کا رجحان طغیان و سرکشی کی طرف بڑھ جاتا ہے تو اسے طغیان و سرکشی ہی میں مزا آنے لگتا ہے۔ خیر کے تمام دروازے اس پہ بند ہوجاتے ہیں۔ اس کی مثال اس مریض کی ہوجاتی ہے جس کے جسم کے فاسد مادے نے اس کی تمام فطری صلاحیتوں کو بیکار کردیا ہو۔ غذا کے ذائقے سے بھی وہ محروم ہو اور حیات کی وہ لذتیں بھی اسے نصیب نہ ہوں جو تندرست اور توانا جسم کی علامت ہوتی ہیں۔

جسم کی سلامتی غذا کی صحت پہ موقوف ہے اور دل کی سلامتی کا دارومدار روحانی غذا پر ہے یہ غذا خدا کا ذکر ہے۔ خدا کی یاد ہے اور اس کے نام کی حلاوت و لذت ہے جو زبان پہ آجائے تو دل کی لذتوں اور روح کی سرشاریوں سے بھر دیتا ہے۔ تعلق اور روحانی رابطے کا خاصہ ہی مستی ہوتا ہے۔ روحانی رابطہ جس سے بھی قائم ہوگا اس کا نام مستی عطا کرے گا۔ ماں کے دل کو مستیوں اور سرشاریوں سے بھر دینے کے لیے بچے کا نام ہی کافی ہوتا ہے ادھر بچے کا نام زبان پہ آیا اور ادھر ماں کی روح مستیوں میں جھومنے لگی۔ سرشاریاں خون کی سرخی بن کر چہرے پہ آشکارا ہونے لگیں۔ اور احساس

نئی کروٹیں لینے لگا۔ احساس کی یہ کروٹیں بھیرے کی سرخی کی رعنائیاں اور جذبات کی بوقلمونی اس رشتہ محبت کا نتیجہ ہوتی ہے جو ماں اور بچے کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ بچہ غافل بن کر اپنے فرائض حیات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنے لیے خیر سمیٹنے کی بجائے شر کا سامان فراہم کرنے لگتا ہے، تو ماں کی مامتا مجسم دعا بن کر اس کی بیداری کے لیے آرزو مند رہنے لگتی ہے۔ اس کی شفقت و رحمت بچے کو ہلاکتوں میں نہیں دیکھ سکتی۔ ہر محبت اپنے محبوب کی عافیت میں دیکھ کر اسے چین آتا ہے بچہ جب گمراہیوں کے بعد گھر لوٹتا ہے تو ماں کی آغوش رحمت کھلی پاتا ہے۔

عبد اور معبود

جو شخص اپنے رب سے بھلائی کا امید وار ہو اسے ان لوگوں سے بہتر سلوک کرنا چاہیئے جن پر اسے اختیار دیا گیا ہو۔ دوسروں پر سختی کرنے والے، اور ان کی معمولی لغزشوں پر برہم ہو کر انہیں عذاب میں مبتلا کر دینے والے خدا تعالیٰ کی رحمتوں کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ رحمتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ جن کے دل رحم و کرم کے جذبات سے معمور ہوں، جو دوسروں کے عیوب دیکھ کر پردہ پوشی کی کوشش کریں، زیر

دستوں کو مصائب و آلام میں گھرا ہوا دیکھ کر ان کا سہارا بنیں، انتقام لینے
کی بجائے عفو و کرم کے خوگر ہوں۔ پردہ دری کی بجائے پردہ پوشی کو اپنا
شعار بنا چکے ہوں۔ معصیت کار کو دیکھ کر اس کی معصیت کاری کا ڈھنڈورا
نہ پیٹتے پھریں۔ بلکہ اس کی ذلت سے خوش ہونے کی بجائے اسے اس مذلت
سے بچانے کی کوشش کریں۔ دانش مند کو مریض سے نفرت نہیں ہوتی
بلکہ وہ اسے ہمدردی کا مستحق سمجھ کر علاج کی طرف توجہ دیتا ہے۔ قابلِ نفرت
چیز گناہ گار نہیں۔ گناہ ہے، جس سے گناہ گار کو بچانے کی ضرورت ہوتی
ہے۔ جو لوگ گنا گار کو گناہ سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اپنے مولا
کے اعتماد کو جیت لیتے ہیں۔ کسی فن کار کے آلودگیوں سے ملوث نقش
کو پاک صاف کرنے کے جذبات سے معمور انسان فن کار کی نگاہوں
میں عزیز ہو جاتا ہے۔ گرد و غبار سے نفرت کرنے کی بجائے اگر کوئی تصویر
ہی سے نفرت کرنے لگے کہ اس پر گرد کیوں پڑی ہے؟ اور اسے توڑ
دینے کی کوشش میں مصروف نظر آنے لگے، تو مصوّر اسے رحم کرم کا
مستحق نہیں سمجھے گا۔ ہر مصوّر کو اپنی تصویر پیاری ہوتی ہے۔ ہر نقاش
کو اپنا نقش عزیز ہوتا ہے، اور وہ کسی حال میں بھی اس کی توہین برداشت
نہیں کرتا۔ نقش کی توہین نقاش کی توہین ہوتی ہے۔ تصویر کا دشمن مصوّر
کا دشمن کہلاتا ہے۔ بچہ بھی ماں باپ کی تخلیق ہوتا ہے۔ اسے غلاظتوں

میں اٹا دیکھ کر کسی کا دل کڑھنے لگے اور وہ اسے سنوارنے کی کوشش میں مصروف ہو جائے۔ اسے اعلیٰ لباس پہنا دے، اس کی زلفیں سنوار دے اور اسے پاک اور منزہ بنا دے تو بچے کے ماں باپ کے اعتماد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیت لیتا ہے۔ پھر اس کے اور بچے کے ماں باپ کے درمیان تفریق نہیں ہو سکتی۔ تخلیق کے ذریعے خالق کا جو قرب حاصل ہوتا ہے، وہ دائمی ہوتا ہے، وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتا۔ محکم رشتے کے ذریعے حاصل کیا گیا تعلق بھی مضبوط اور محکم ہوتا ہے۔

عبد اور معبود کا رشتہ بھی بڑا مضبوط اور محکم رشتہ ہے۔ بندہ اپنے مولےٰ کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اس کی تخلیق ہے۔ اس تصویر کو اس نے دل سے بنایا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ ذلیل ہو۔ دنیا کی نگاہوں میں بے حقیقت قرار پائے اور اپنے مالک کی رسوائی کا موجب بنے۔ اس کی عظمتیں جس قدر آشکارا ہوں گی۔ صانع کی عظمت و قدرت اسی قدر ظاہر ہو گی۔ ہر انسان کو گناہ سے بچانا اور اس کی عظمتوں کے تحفظ کے لیے کوشاں رہنا انسان کا اولین فرض ہونا چاہیئے۔ اخلاق و اعمال کی اصلاح طنز و تعریض کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے مجسم خلق بننے کی ضرورت ہوتی ہے، اس راہ میں ایثار کام دیتا ہے خلق نا ایثار سے محروم انسان دوسروں کی اصلاح نہیں کر سکتا، بلکہ وہ اصلاح

کا جذبہ لے کر اٹھتا بھی ہے۔ تو وہ مفید ثابت ہونے کی بجائے مضر ثابت ہوتا ہے۔ انبیاؑ اور صلحائے کے اصلاحی اقدامات اسی لیے مفید ثابت ہوئے ہیں کہ ان کے دل خیر کے جذبات سے معمور تھے، اور ان کی خطابت کی شراب میں کوئی تلخی نہ تھی۔ جسے پیتے ہی رگ و ریشے میں نئی زندگی دوڑنے لگتی تھی۔ اور انسان کو اپنی ذات کا عرفان ہونے ساتھ ساتھ ذاتِ باری کا عرفان بھی ہونے لگتا تھا خطابت کی وہی شراب انسان کی روح کو نئی لذتیں عطا کر سکتی ہے جو ایثار و خلوص کی بھٹی میں کشید کی گئی ہو اور محبت کے پیمانوں میں بھر کر پیش کی جائے۔ نفرت کے خم خانوں سے لائی گئی صہبا خواہ کتنے بھی اچھے پیمانوں میں بھر کر پیش کی جائے، وہ لذت و کیفیت سے محروم ہوتی ہے اور وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جو مخلصانہ جذبات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

دل کے معالات

زندگی جو نفس کی آمد و شد سے عبارت ہے یہ نہ مال و دولت سے سکون پذیر ہوتی ہے اور نہ ہی تاج شہی پہن کر انسان مسرور و مطمئن ہو سکتا ہے۔ قلبی اطمینان خاص عطیہ ربانی ہے جو صرف انہی لوگوں کو ملتا ہے

جنہیں رحمتِ خداوندی اپنی نوازشات کے لیے چن لیتی ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام موسلا دھار بارش میں سفر کر رہے تھے۔ بارش سے بچنے کے لیے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑے ہوئے تو ان کی نظر ایک لومڑی پہ پڑی۔ جو دوڑتی ہوئی آئی اور اپنے بل میں گھس گئی۔ روح اللہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ لومڑی کے لیے بھی ایک بل موجود ہے جہاں وہ پناہ لے سکتی ہے۔ لیکن میرے لیے جھونپڑی بھی نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی روح اللہ پر وحی نازل ہوئی کہ آپ بھی لومڑیوں کی طرح کی آرزو کرنے لگے تو محبت کے تحفوں کو کون قبول کرے گا؟ ہمارے دوستوں کی آرزوؤں اور لومڑیوں کی آرزوؤں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے، انسان مال و دولت اور جاہ و حشمت سے بڑا نہیں بنتا۔ اس کی عظمت کا معیار وہ آرزوئیں ہوتی ہیں جو اسے حیوانوں کے زمرے سے نکال کر فرشتوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ زندگی تمام تر آرزوؤں اور تمناؤں کا محور و مرکز اگر مادی دنیا ہی بن کر رہ جائے۔ اور زندگی اسی کے گرد گھومنے لگے تو انسان کا لاہوتی دنیا سے رشتہ استوار نہیں رہ سکتا۔ جس جہان کا کبھی دل میں خیال پیدا نہ ہو، نہ اس کے حصول کی تمنا ہو اس کی واردات و کیفیات سے دل کیسے لذت یاب ہو سکتا ہے؟ جو دنیا دل میں

بسی ہو گی جو جہان دل میں آباد ہو گا۔ اسی کی لذتیں وارد ہوں گی، اسی کی کیفیات مزا دیں گی۔ ظاہری جہان ہی مزا نہیں دیتا، باطنی جہان بھی مست و سرشار کر دیتا ہے۔ کسی قیدی کو اسارت کی زندگی میں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ صبح قید سے نجات مل جائے گی تو گھر پہنچ کر حاصل ہونے والی خوشی کے تصور ہی سے اس کی رات صبح خنداں کی طرح جگمگانے لگتی ہے اور اس کے دل سے قید کی زندگی کے مصائب و آلام کا خیال مٹ جاتا ہے۔ چند یوم تک پھانسی پانے والے قیدی کو اگر انتہائی خوش و خرم بھی رکھا جائے تو اس کے دل سے موت کا خوف زائل نہیں ہو گا۔ اچھے خیال سے بھی روح کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور برا خیال بھی انسان کو پریشان کر دیتا ہے خواہ وہ کسی گذرے ہوئے حادثے کا خیال ہی نہ ہو۔

وہ دل مبارک ہیں جو مصائب و آلام میں بھی اخروی زندگی میں حاصل ہونے والی رضائے دوست کی تابانیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ رضا کے جمال پر نظر رہتی ہے تو مصائب کی شدت بھی کم ہو جاتی ہے اور روح پر ایک نشہ بھی طاری رہنے لگتا ہے۔ بعض کوچوان تانگے میں چلنے والے گھوڑے کو نشے کا عادی بنا کر تکلیف کے احساس سے بچا لیتے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ نشہ اسی گھوڑے کو دیا جاتا ہے جو مالک کی رضا کا تابع ہو، جو

مالک کی رضا کا تابع نہیں بنتا۔ اس کے مقدر میں چکر ہوتے ہیں اور اس کی جھانٹوں سے یہ تواضع کی جاتی ہے۔

بندہ بھی جب خدا کی رضا کے لیے مصائب برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا تو اسے خانۂ قدس سے ایک نشہ اور ایک سرشاری عطا ہوتی ہے جو اسے مصائب و آلام کی شدّت محسوس نہیں ہونے دیتی۔ بلالؓ کو ایک نشہ ہی تو عطا تھا جو دہکتے ہوئے انگاروں پر مست و سرشار بنائے ہوئے تھا۔ نشے میں تو جان بھی چلی جائے تو احساس نہیں ہوتا۔ نشہ نہ ہو تو کانٹے کی چبھن بھی محسوس ہوتی ہے اور انسان کراہنے لگتا ہے۔ آرزوؤں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار خدا سے اس نشے کی طلب بھی کرنی چاہیئے جو خاصانِ بارگاہ کا حصّہ ہوتا ہے۔

احساس کے کرشمے

سفر کا آغاز کرنے سے پہلے انسان کو دو کیفیتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے یا تو اس پر نشاط کا غلبہ ہوگا۔ دل نشاط کے جذبات سے معمور نظر آئے گا اور یا اندیشے اور دامن گیر ہوں گے۔ قدم اٹھانے کے ساتھ ہی خطرات کی ہولناکیوں کے تصورات انسان کے عزائم

کا شیرازہ منتشر کر کے رکھ دیں گے۔ خطرے طلب کی خامی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جہاں عزم راسخ ہو، خطرات راہ نہیں پا سکتے۔ بلکہ خطرات سے انسان دوچار ہوتا بھی ہے، تو ان کی ہولناکیوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

منزل کی طلب خام ہو، تو معمولی خطرات بھی مہیب طوفانوں کی طرح نظر آنے لگتے ہیں۔ بدر و حنین کے معرکوں میں کفار کی صفیں الٹنے والے غازیوں کو جو مشکلات درپیش تھیں، وہ ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے خدا کے دین کی راہ کو حصولِ مقاصد کا ذریعہ جان کر قبول نہیں کیا تھا۔

شکستگی اسی وقت طاری ہوتی ہے، اور مایوسیاں اسی وقت گھیرتی ہیں، جب انسان کی قائم کی توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ شروع ہی میں کسی راہ کو اپنے حصولِ مقاصد کا ذریعہ جان کر قبول کرنے کی بجائے اگر کسی محبوب شخصیت کی رضا کا ذریعہ سمجھ کر قبول کیا جائے، تو راہ کی ناہمواریاں پریشان نہیں کرتیں۔ ہر ٹھوکر ایک نئی لذت بخشتی ہے، پاؤں میں جو کانٹا چبھتا ہے نئی لذتیں عطا کرتا ہے۔

صحابہؓ کو اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اگر لذتیں

اور سرشاریاں عطا کر رہی تھیں تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی، کہ ان کے دل و دماغ پر یہ احساس طاری تھا کہ یہ مشکلات انہیں نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں، بلکہ خدا اور رسولؐ کی رضا جوئی کے لیے پیش آ رہی ہیں۔ مسرت کے جذبات سے دل لبریز ہو، تو معمولی غم روح پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ مسرت کے جذبات غم کو اپنی کیفیت میں ڈھال لیتے ہیں، غم نشاط آگیں ہو جاتا ہے۔ اور اگر دل مغموم ہو، غم کی بے پناہی دل کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہو، تو معمولی نشاط کے جذبات بے فائدہ اور مہمل بن کر رہ جاتے ہیں۔ مغلوب کو غالب کے مزاج میں ڈھلنا پڑتا ہے۔

غازیانِ بدر و حنین کے دل چونکہ سرمدی نشاط کے جذبات سے معمور تھے، انہیں یہ احساس نئی زندگی عطا کر رہا تھا کہ وہ رضا کی منزل کے مسافر بن کر نکلے ہیں، جو افتاد بھی ان پر پڑے گی، وہ انہیں رضا کی منزل کے قریب کر دے گی۔ ان کے قرب کا ذریعہ بن جائے گی۔ اسی لیے تیر کھانے میں بھی مزا آتا تھا، زخموں کی ٹیسیں بھی نشاط انگیز بن جاتی تھیں۔ وہ اپنی پیاس کی شدت کو چشمۂ حیواں کی شادابیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ جو تشنگی انہیں خدا کی راہ میں نصیب ہوتی تھی، وہ انہیں جان سے زیادہ عزیز تھی اور یہ احساس کبھی ان کے قریب نہیں بھٹک

سکا، کہ انہوں نے خسارے کی راہ اختیار کی ہے۔ خسارے کا احساس ہوس میں ہوتا ہے، محبت میں نہیں۔

سود و زیاں کا احساس موجود ہو تو انسان تاجر تو کہلا سکتا ہے لیکن اسے محبت کی راہ کا مسافر نہیں کہا جا سکتا۔ ہوس میں، اپنے احساسات کی رعایت برتی جاتی ہے اور محبّت سراسر محبوب کی رضا کا سودا ہے۔ احساسات ہوتے ہیں تو وہ بھی محبوب کے، رضا ہوتی ہے تو وہ بھی اسی کی۔ اربابِ ہوس کے دل کی رفتار اپنے جذبات و احساسات سے قائم ہوتی ہے۔ اور شہیدانِ محبّت کے دل کی دھڑکن محبوب کے قدموں کی آواز سے عبارت کہلاتی ہے۔ دل دھڑکتا ہے تو وہ محبوب کی آہٹ کا پیامبر بن جاتا ہے۔ آواز اگر اپنی ہو۔ جذبات و خیالات اپنے ہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کوئی دل میں سمایا نہیں، کسی نے دل کو اپنی جلوہ گاہِ ناز کے لیے منتخب نہیں کیا۔

خالق اور تخلیق

درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے شاگرد استاد کی عظمت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اُمتی نبیؐ کی عظمتوں کا امین کہلاتا ہے اور بندہ وہ ہے، جسے دیکھ کر خالق کی معرفت حاصل ہو۔

ہر تخلیق اپنے خالق کی تخلیقی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جو نقش ناتمام ہو، اپنے خالق کی عظمتوں کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی رسوائی کا موجب بن جاتا ہے۔ دنیا میں کون سا خالق ہے جو اپنی رسوائی کو پسند کرے؟ بندہ جس کی تخلیق ہی احسن تقویم میں ہوئی ہے، جب اپنے مقام سے گر جاتا ہے تو یہی نہیں کہ اپنے لیے ذلتوں کے سامان فراہم کر لیتا ہے، اپنے خالق کے لیے بھی وجہ افتخار نہیں رہتا۔ قدرت کو انہی بندوں پہ ناز ہوتا ہے۔ جو بندگی کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اسی مفہوم کی جھلکیاں ان کے اعمال و کردار میں صاف طور پہ دکھائی دیتی ہیں۔ بندگی کے مفہوم سے نا آشنا انسان جب اپنی تخلیق کا مقصد بھول کر غلط راہ پہ گامزن ہو جاتا ہے تو اسے دیکھ کر قدرت بھی شرمانے لگتی ہے۔ کہ میں نے اس

لیے تخلیق کا لباس عطا کیا تھا۔ غیر معمولی صلاحیتیں اس لیے بخشی تھیں کہ یہ انہیں غلط استعمال کرتا پھرے۔ حکومت سے اسلحہ لینے کے بعد کوئی شخص حکومت ہی کے خلاف استعمال کرنے لگے تو وہ معتوب قرار پاتا ہے۔ تمام ذاتی صلاحیتیں قدرت کا عطیہ ہیں۔ جو انسان کو حق کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے عطا کی گئی ہیں ان کے صحیح استعمال سے انسان خدا کا مقبول بن سکتا ہے اور غلط استعمال سے نہ صرف یہ کہ اس کی پوزیشن قدرت کی نگاہوں میں مخدوش ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ راندہ درگاہ قرار پاتا ہے۔ مقبولیت اور مردودیت کا معیار اطاعت ہے۔ وہ بندگی ہے جو انسان میں عبودیت کی شان پیدا کر دے۔ اور اسے ان صفات سے متصف کر دے جو خالق کی عظمتوں کا پتہ دیں۔

نقش کے ذریعہ ہی نقاش کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ فن پارہ ہی فنکار کے جاننے کا ذریعہ بن سکتا ہے جو لوگ فن کو جدا کر کے فن کار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں فنکار کا کلی عرفان حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ عرفانِ رسولؐ کے بغیر عرفانِ ذات ممکن نہیں، اس لیے کہ حضورؐ دستِ قدرت کا وہ عظیم شاہکار ہیں جس پہ قدرت کو ناز ہے۔ ہر فن کار کا ایک ایسا شاہکار ضرور ہوتا ہے جس میں اس کی عظمتِ فن پوری طرح آشکار ہوتی ہے۔ اور ایسا شاہکار فن کار کو جان سے عزیز ہوتا ہے۔ حضورؐ کی محبوبیت کی یہی وجہ ہے کہ حضورؐ

کی ذات سے ذاتِ باری کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ معرفتِ ربانی کے ہوتا ہے۔ معرفتِ ربانی کے حجاب در حجاب جلوے جن تک عقلِ انسانی کی رسائی ممکن نہیں۔ جمالِ محمدی کی ایک جھلک دیکھ لینے سے نظر آسکتے ہیں۔ فن جب تخلیق میں پوری طرح جلوہ گر ہو جائے تو فن کار کو بے حجاب ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، وہ خود پس پردہ چلا جاتا ہے اور فن کو آشکار کر دیتا ہے۔

طور پر تجلیوں کی بارش اسی وقت تک کے لیے تھی جب تک قدرت کے فن کو اوجِ کمال نہ ملا تھا۔ یہ فن ذاتِ محمدی کی صورت میں ظاہر ہو گیا، اور تخلیق کو معراجِ کمال نصیب ہو گئی۔ تو اب فن کار کی بے حجابی کی ضرورت باقی نہ رہی؛ تخلیق بے حجاب ہو گئی اور خالق چھپ گیا، کیونکہ اب تخلیق خالق کی معرفت کے لیے کافی تھی۔

خیر و شر

شاعرانہ زبان میں تیمور اور چنگیز کو اللہ کے نشتر کہا گیا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو تیمور و چنگیز ہی اللہ کے نشتر نہیں ہر وہ حادثہ جو ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے پیش آتا ہے۔ اللہ کے نشتر کی حیثیت رکھتا ہے۔

نشتر زنی اسی جسم پر کارآمد ثابت ہو سکتی ہے جس کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون موجود ہو، مردہ جسم پر نہ ہی نشتر زنی کا اثر ہوتا ہے اور نہ ہی اسے وہ بیداری نصیب ہو سکتی ہے، جو زندگی کی علامت کہلا سکتی ہے، مسلسل اور پیہم نشتر زنی سے جب خون کا ایک قطرہ بھی برآمد نہ ہو تو اس جسم کو دفن کر دیا جاتا، کیونکہ مردے سے کسی خیر کی امید نہیں کی جا سکتی، اس کی عفونت سے فضا کو مسموم ہونے سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے کوئی قوم جب زندگی کی علامت سے محروم ہو جاتی ہے تو قدرت اس کی بساط سمیٹ دیتی ہے اور اسکی جگہ کسی ایسی قوم کو لایا جاتا ہے، جو زندگی کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے جب تک وہ اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ مشیت کے تابع رہ کر زندگی کی بہار دکھاتی ہے، اور ماحول کو اپنے اعمال کی دولت سے بہرہ ور کرتی ہے، اس پر زندگی کی راہیں کشادہ رہتی ہیں، اسے خوب

پھیلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے، جب اسے خود غرضی اور تن آسانی کے رجحانات مغلوب کر کے بیکار بنا دیتے ہیں، اس کے بحرِ خودی کا پانی خشک ہو جاتا ہے۔ اور اس کے دریا سے کسی موجِ تند جولاں کے اٹھنے کی توقع نہیں رہتی تو قدرت کو اس کی زندگی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اس کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے، اور کرۂ ارض پر اس کی نوحہ خوانی کرنے والا بھی کوئی نہیں رہتا۔ دنیا میں کیسی کیسی غالب قومیں گزری ہیں؟ ان کے جلال و جبروت کا کیا عالم تھا؟ دلوں پر ان کا کیا رعب طاری تھا؟ ان کی شان و شوکت کے پرچم کو کیا کیا عظمتیں نصیب تھیں؟ لیکن آج ڈھونڈنے سے بھی ان کا سراغ نہیں ملتا، ان کے تہذیب و تمدن کے آثار و نقوش کو بھی ماہ و سال کی گردشیں کھا گئیں، ان کا سارا ذہنی و فکری سرمایہ انقلابِ زمانہ کی نذر ہو گیا ان کی ایسی علامات موجود نہیں جس سے ہم ان کی عظمتوں کا اندازہ لگا سکیں جن کے نشانات موجود ہیں، وہ بھی عبرت کی تصویریں ہیں اور شاید قدرت نے انہیں عبرت پذیری ہی کے لیے رکھ چھوڑا ہے قوموں کے عروج و اقبال کو چھوڑیئے، ہماری آنکھوں نے کیسے کیسے افراد کے عروج و اقبال کے ادوار دیکھے ہیں؟ کیسے کیسے جگمگاتے چہرے، مسکراتی آنکھوں اور صحت مند جسموں کی بہار دیکھی ہے۔ ان کے دل نشین اندازِ

خطاب کے مزے لوٹے ہیں، اور نطق و گفتار ٹپکنے والے رس کی لذت کو رگ رگ
و پے میں محسوس کیا ہے۔ مدتوں ہمارا وجدان جھومتا ہے، ذوقِ سماعت نے
مستیاں لی ہیں، اور روح کو سرشاری نصیب ہوئی ہے۔ آج بھی ان کی
صحبتوں کی یاد کو ہم قیمتی سرمایہ جان کر سینوں سے لگائے ہوئے ہیں،
اور اپنی خلوتوں میں ان یادوں کو تازہ کر کے لذت محسوس کرتے ہیں،
زندگی کی راہوں میں ہمیں مستیاں اور سرشاریاں عطا کرنے والے ہی
نہیں ملے، کچھ خدا کے ایسے بندوں سے مڈبھیڑ ہوئی ہے جنہوں نے
حیات کا سارا مزا کرکرا کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کی یاد بھی تلخیاں بخشتی
ہے، اور ذوق و وجدان کو ان کے تصور ہی سے ابکائی آنے لگتی ہے
انسان جو بھی فریضہ حیات سرانجام دیتا ہے، وہ عارضی اور ہنگامی نہیں
ہوتا بلکہ ایک مستقل اور پائدار اثر رکھتا ہے۔ دلوں کو متکیف بھی کرتا ہے
اور بے مزہ بھی، مستیاں بھی عطا کرتا ہے اور بے کیفیوں سے بھی دوچار
کرتا ہے۔ زندگی کی راہوں میں اجالا بھی پھیلاتا ہے اور تاریکیوں
کے مہیب بادل بھی چھوڑ جاتا ہے۔ خیر و شر دونوں کو پھیلانا اور اپنے دامن میں سمیٹ
لینا انسان کی مقدرت میں دے دیا گیا ہے وہ اپنی پسندیدہ راہ اختیار کرنے میں
ہر طرح آزاد اور خود مختار ہے۔

مسبّب اور اسباب

یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی لاٹھی بے آواز ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات چونکہ خود لطیف ہے اس لیے اسے اپنی صفات کے ظہور کے لیے خارجی اسباب و علل کی ضرورت نہیں ہوتی لطیف کی عطا بھی لطیف ہوتی ہے خواہ وہ قہر و غضب کی صورت میں ہو یا لطف و کرم کی صورت میں۔ بسا اوقات خارجی اسباب و علل کے فقدان کے باوجود ہمارے دل میں نشاط کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے اور وہ ہماری حیات کے ہر گوشے کو مسرتوں، لذتوں اور سرمستیوں سے بھر دیتا ہے، حالانکہ ہمارے پاس مسرت کے اسباب نہیں ہوتے، مسرت کی کوئی خارجی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور ہم مسرور ہوتے ہیں۔ ایسے ہی غم کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی اور ہم غم کی بے پناہیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ رنج و راحت خوشی اور غم یہ سب اسی کی عطائیں ہیں۔ خدا تعالیٰ کی نصرت بھی بسا اوقات غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہونے لگتی ہے جسے دیکھ کر ہم آئینہ حیرت بن جاتے ہیں ایسے ہی اس کا قہر و غضب

بھی بسا اوقات غیر متوقع طور پر انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اس کی مسرتوں کا تمام تر شیرازہ منتشر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسباب و علل نہ خوشی کے نظر آتے ہیں نہ غم کے۔ رنج و راحت اور خوشی و غم کے خالق کو ان چیزوں کو ودیعت کرنے کے لیے اسباب کی احتیاج نہیں اسباب خود اپنے مسبّب کے تابعِ فرمان ہیں۔ جیسا حکم ہوتا ہے ویسی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ غم بھی کبھی نشاط انگیز بن جاتا ہے اور خوشی بھی کبھی ماتم کا پیغام ثابت ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو قدرت نے چشم بینا عطا کی ہے ان کی نظر ہر حال میں اسباب پر نہیں بلکہ مسبّب پر رہتی ہے۔ وہ اسی سے نصرت و اعانت طلب کرتے ہیں اور اسی کو قاسمِ نعمت اور خالقِ غم جان کر اس کی پرستش و عبادت کرتے ہیں۔

مالک رح بن دینار جو امتِ محمدیہ کے عارفین میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور جن کے چشمۂ عرفان سے ایک جہان سیراب ہوتا ہے، اپنے ابتدائی زمانۂ حیات میں صبر آزما حالات سے دوچار رہے ہیں اپنے ایامِ شباب میں جبکہ وہ تحصیل علم میں مشغول تھے تو ان کا معمول یہ تھا کہ وہ ایک رفیع الشان محل کی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے ایک دفعہ صاحبِ خانہ کے گھر چوری ہو گئی۔ نقب زنی جس دیوار کے ذریعہ کی گئی تھی وہ مالک رح بن دینار کی نشست گاہ سے

کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھی، اس لیے چوری کے الزام میں انہیں پکڑ لیا گیا۔
ایک شکستہ حال انسان جو غریب الوطنی میں تحصیلِ علم میں مشغول تھا اس کے لیے یہ الزام کوئی معمولی دلخراش نہ تھا۔ یاس کے عالم میں اس نے اسی ذات کو پکارا جو اس کی محافظ و نگران تھی۔ وہ شدتِ جذبات میں بلبلاتا ہوا بولا کہ قادر و قیوم تو نے اپنے مقدس کلام میں فرمایا ہے کہ

"گواہ جب گواہی کے لیے بلائے جائیں تو گواہی دینے سے انکار نہ کریں۔"

میں اپنی بے گناہی کی گواہی کے لیے تجھے بلا رہا ہوں۔ میری پکار سن، مالک بن دینار کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے قدرت نے غیب سے یہ اسباب پیدا کر دیے کہ جس چور نے نقب لگائی تھی اسے جب یہ معلوم ہوا کہ میرے جرم کی پاداش میں ایک ایسے انسان کو پکڑ لیا گیا ہے جو خدا تعالیٰ کے دین کی نشر و اشاعت کے لیے اپنی تمام زندگیوں اور راحتوں کو قربان کر چکا ہے تو اس کے دل میں رحم کے جذبات پیدا ہو گئے اور اس نے جرم کی سزا بھگتنے کے لیے خود کو عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ خدا تعالیٰ کی نصرت تھی جو چور کی صورت میں سامنے آئی اور ان کی بے گناہی پہ مہر تصدیق ثبت کر گئی۔
بعض لوگ جو خدا تعالیٰ کو قادرِ مطلق جان کر اس کے ساتھ اخلاص

مندی کی ایک خاص وضع قائم کر لیتے ہیں وہ ان کی وضعداری کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے کیلئے غیب سے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اسباب کے بندے اسباب کے بندے رہ کر بھی مطمئن نہیں ہوتے اور خدا کے بندے اسباب نہ ہونے کے باوجود بھی سکون کی دولت سے بہرہ ور نظر آتے ہیں۔ سکون اسباب سے رشتہ جوڑنے میں نہیں، اسباب کے خالق کو اپنا لینے ہیں ہے۔

قول اور عمل

دل میں مخلصانہ جذبات موجود ہوں، تو انسان کے قول و فعل میں تطابق ہوتا ہے۔ زبان دل کی ترجمان بن جاتی ہے اور عمل اس کی صداقت کی شہادت دیتا ہے۔ خلوص سے عاری جذبات کی یہ شان نہیں ہوتی، وہاں قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے اور ایسا انسان خواہ کسی بھی بارگاہ سے منسلک ہو، اسے فوز و فلاح حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کا یہی نفاق اسے مردودیت تک پہنچا دیتا ہے۔

مقبولیت مخلصانہ جذبات کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے خلوص کی متاع ہے کہ انسان جب بھی کسی بارگاہ میں

پہنچتا ہے توٹوٹ جاتا ہے۔ خلوص کے صادق اور کاذب ہونے کا
معیار قول نہیں، عمل ہے مخلصانہ جذبہ خواہ کسی بھی نوعیت کا
ہو، وہ قول کی دنیا تک محدود نہیں رہ سکتا۔ عمل کی صورت
میں ظاہر ہو کر رہے گا اور اس کے اثمار اپنی شان ضرور
دکھائیں گے۔

خلوص کی پہچان ہمیشہ عمل کے میدان میں ہوتی ہے۔ عمل جتنا محکم اور
مضبوط ہوگا، خلوص کو بھی اسی نسبت سے مضبوط سمجھا جائے گا۔ دنیا میں
ایسا کوئی خلوص شایان توجہ قرار نہیں پایا، جو عمل کی قوت سے محروم ہو۔
قرآن بھی انہی لوگوں کے خلوص کو سراہتا ہے اور انہیں قدر و منزلت
کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو سراپا عمل تھے، جنہوں نے ایثار کے
نوادرات پیش کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، دنیا میں وہ فتوحات
حاصل کیں جنہیں خلوص و محبت کی فتوحات کہا جا سکتا ہے۔ سخا اور ایثار
میں یہ فرق ہے کہ سخا کے وقت انسان کو اپنی ضروریات کا خیال رہتا
ہے۔ لیکن دل میں اگر ایثار کا جذبہ پیدا ہو جائے تو احساس ذات مٹ
جاتا ہے۔ کسی دوسری ذات کی خوشنودی مزاج کے جذبات دل میں
موجزن نظر آنے لگتے ہیں۔ سخا عام انسانوں میں نظر آ سکتی ہے لیکن
ایثار خواص کا حصہ ہے۔ یہ انہی لوگوں سے ظاہر ہوگا جنہیں کوئی ذات

غائت درجہ محبوب ہو اور ایسے ہی ایثار پیشہ لوگوں کو محبوبیت کا مقام مل سکتا ہے، جو کسی ذات کے لیے ایثار کرنے کو عزیز جانتے ہوں، ایثار ہمیشہ محبوب کے لیے ہوتا ہے اور یہ انسان کو محبوب بنا کر چھوڑتا ہے محبوبیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے ایثار کی راہ سے گزرنا ناگزیر ہوتا ہے ایثار ہو تو محبوبیت مل کر رہتی ہے ایثار نہ ہو تو اس راہ میں دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے جو مقبول انسان بھی محبوبیت کی منزل تک پہنچے ہیں، انہوں نے یہ راہ ایثار کے ذریعے طے کی ہے۔ ایثار صرف مال و دولت خرچ کر دینے کا نام نہیں یہاں احساسات کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے۔ جذبات کا نذرانہ گذارنا پڑتا ہے اگر اپنے احساسات اور جذبات کی پاسداری مطلوب ہو تو محبوب کی نزاکتِ احساس کو ملحوظ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک کی طلب دوسرے کی نفی کر دیتی ہے، اپنے احساس کی نزاکت ملحوظ ہو تو محبوب کی نزاکتِ احساس کا احترام نہیں کیا جا سکتا، اور اگر محبوب کعبہ مقصود بن جائے تو اپنے احساسات کی قربانی لازمی ہو جاتی ہے۔

صدیق طالب وہی ہوتا ہے، منزل بڑھ کر اسی کے قدم لیتی ہے، جو منزل پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

یہ راہ صدیق اور کاذب انسانوں میں اس درجہ فرق اور امتیاز پیدا کر دیتی ہے، کہ دونوں کا پہچاننا کوئی مشکل نہیں رہتا۔ صدیق چوٹ کھا کر آگے بڑھتا ہے اور کاذب کا سارا نشہ کافور ہو جاتا ہے۔

نور اور ظلمت

گھنے اندھیرے میں تیز روشنی کی ضرورت ہوتی ہے ایک چھوٹے سے کمرے کو روشن کرنے کے لیے ایک چراغ کی لو بھی کافی ہو سکتی ہے شہر کی ظلمتوں کو چند مشعلوں کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے لیکن وسیع و عریض کرۂ ارض اگر ظلمتوں کی لپیٹ میں آجائے تو وہاں مشعلوں کا نور کافی نہیں ہوتا۔ وہاں آفتاب ماہتاب کی جلوہ باریاں ہی کام دے سکتی ہیں۔

بعض حالات میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی ضو بھی منزل کے سراغ کا باعث بن جاتی ہے اور بعض اوقات آندھیوں اور طوفانوں کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں، یہاں چراغ کام نہیں دیتا ماہتاب ہی کام دے سکتا ہے جو آندھیوں اور طوفانوں کی زد سے باہر ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے عہد میں خلقِ قرآن کا جو فتنہ اٹھا تھا اسے

حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ مصیبت کوئی بھی تنہا نہیں آتی ایک فتنہ دوسرے فتنے کو جنم دیتا ہے اور ماحول جتنا ساز گار ہو یہ سلسلہ اتنا ہی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

حکومت کے فکری گمراہی میں مبتلا ہونے کے بعد وہ لوگ سرکاری دین کو خدا کا دین ثابت کرنے کے لیے ذہانتیں لڑا رہے تھے جن کا ذہن وضمیر بکاؤ مال تھا اور جن کے دل خوفِ خدا سے بالکل خالی تھے امام احمد بن حنبلؒ کا وجود ان کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا کیونکہ احمد بن حنبلؒ ہی ان لوگوں کے دلائل کا تار و پود بکھیرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے پہلو میں جو دل تھا اس میں خدا کی محبت جاگزیں ہو چکی تھی۔ نہ اقتدار انہیں ڈرا سکتا تھا نہ دنیا کی محبت اپنی طرف کھینچ سکتی تھی حال کچھ ایسا ہو چکا تھا کہ دل کی دھڑکن پے بہ پے محبوبِ حقیقی سے کہہ رہی تھی کہ۔

آئینہ نیست دل کہ دہد رو بہر کسے
ایں پارۂ عقیق بنامِ تو کندہ شد

احمد بن حنبلؒ کی تبلیغ کے جواب میں یہی نہیں کہ ان لوگوں کی آتشِ غیظ و غضب اور زیادہ بھڑکتی تھی، بلکہ وہ امام کو حکومت کی نگاہوں میں معتوب بنانے کے لیے اور تیزی

سے سازشوں کے جال بننے لگتے۔ ہما کے معدوم ہو جانے
کے باعث کوئی شخص بوم کے زیر سایہ آنا گوارا نہیں کرتا،
لیکن سیاسی بوموں کی ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ دنیا سے وہ
ہما معدوم ہو جائیں، جنہیں ملت میں غیر معمولی محبوبیت حاصل ہے
چنانچہ ایسے ہی لوگوں نے خلیفہ معتصم باللہ سے کہا یہ شخص خلق قرآن
کے نظریئے کی مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ قیامت
کے دن خدا تعالیٰ کا دیدار ہوگا، حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ آنکھ اس غیر
محدود ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

اس باب میں معتصم نے جب امام حنبل رحؒ سے استفسار کیا تو انہوں
نے کہا کہ میرے دعوے کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ قیامت
کے دن ربانی جمال یوں نظر آئے گا جیسے چودھویں کا چاند نظر آتا ہے۔

اس زمانے میں ابھی ان لوگوں کا گروہ پیدا نہ ہوا تھا جو قرآن
کو کافی کہہ کر حدیث کا انکار کرتے ہیں، ورنہ معتصم اور اس کی پارٹی کے
لوگ کہہ سکتے تھے کہ خدا کے دیدار کے قائل ہو تو قرآن سے دلیل لاؤ ہم
حدیث کو نہیں مانتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ معتصم نے اپنے
ایک عالم سے اس دلیل کا جواب طلب کیا تو اس نے کہا کہ میں
جواب سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہتا ہوں۔ چنانچہ اپنے گروہ میں

مگر اس نے جب اس مشکل کا حل معلوم کرنا چاہا تو ایک ذہین انسان بولا کہ اس میں فلاں راوی ایسا ہے جو بعض محدثین کے نزدیک غیر ثقہ ہے چنانچہ معتصم کو بھڑکانے والے عالم کو یہ دلیل بہت پسند آئی وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کی خوشی کا باعث یہ نہ تھا کہ اس پر حق واضح ہو گیا ہے بلکہ خوشی کی یہ وجہ تھی کہ وہ اسلام کے ایک امام کو دُرّوں کا مستحق ثابت کر سکتا ہے

نظامِ قدرت

قدرت کی تقسیم کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کی حکمتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ کسی کو کوئی خوبی دے دی جاتی ہے اور کسی کو کسی وصف سے نواز دیا جاتا ہے۔ محروم کوئی بھی نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض کے اوصاف پر ہماری نظر نہیں پڑتی۔

مصوّر نے جن مصلحتوں کے پیشِ نظر نقاشی کی ہوتی ہے، وہ ہماری نظر سے اوجھل ہوتی ہیں، اس لیے ہم مخمصے میں پڑ جاتے ہیں کہ یوں نہیں یوں ہونا چاہیئے تھا۔ مصوّر کے فن پر اعتراض کرنے سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی منشا اور مراد کا پورا پورا علم ہو۔ انسانی علم چونکہ ذات احدیت کے علم کے مقابلے میں نہایت قلیل ہے اسی لیے عارفین اس

کی کسی بات پر اعتراض نہیں کرتے۔ خیر پہنچتی ہے تو شکر کرتے ہیں۔ شر سے دو چار ہونا پڑتا ہے تو پھر بھی ان کی زبان پر شکر کے کلمات ہوتے ہیں کیونکہ وہ ذات تمام تر خیر ہے۔ جو بھی اس کی طرف سے آتا ہے وہ بھلائی ہی بھلائی اور خیر ہی خیر ہوتا ہے۔

کوتاہ اندیش جو اپنی محدود عقل کی چار دیواری کو عقل و دانش کی کل کائنات سمجھنے لگتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حکمتوں پر اعتراض کرنے بیٹھ جاتے ہیں، حالانکہ ان کی اپنی بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بسا اوقات وہ اپنے جیسے ضعیف، کمزور اور بے بنیان انسان کی حکمتوں کو سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ اس امر کا مشاہدہ ہمیں بالعموم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔

تخلیق کوئی بھی بغیر مقصد کے نہیں ذرہ بھی کائنات کے حسن و جمال کو فروغ بخشنے کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ جتنی ستارہ۔ نجوم و کواکب کی ساری دلفریبیاں، رنگینیاں اور رعنائیاں بجا اور درست، لیکن چند ذرے سمٹ کر بہار دکھاتے لگتے ہیں تو ان کی تابشیں نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہیں اور مصور فطرت کی بوقلموں تصویریں دیکھ کر زبان حمد و ثنا میں مصروف ہو جاتی ہے اور دل تقدیس کے جذبات سے لبریز ہونے لگتا ہے۔ نگاہوں کو نئی لذت ملتی ہے۔

باغ کی زیب و زینت کے لیے پھول کا وجود ہی ضروری نہیں، کانٹا بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ مالی کہیں چنبیلی کے پھول کی کاشت کرتا ہے۔ کہیں گلاب اور موتیا کو پانی دیتا ہے اور کہیں خاردار جھاڑیاں نصب کر دیتا ہے یہ ساری اس کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اپنے ہی ہاتھ سے سیراب کیے ہوئے پودوں کی سرسبز و شاداب شاخوں کو قینچی سے کاٹ دیتا ہے، چمن بندی کے لیے یہ عمل بھی ضروری ہوتا ہے۔ کسی انسان کو مالی کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے نہیں دیکھا گیا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ اپنا خون پسینہ ایک کر کے مہکانے والی شاخوں کو پروان چڑھانے کے بعد کیوں کاٹ رہے ہو؟

لیکن انسان کی بوالعجبی کا یہ عالم ہے کہ وہ اسی نوع کا کوئی عمل قدرت کی طرف سے دیکھتا ہے تو اعتراض کرنے لگتا ہے۔ مالی کے خلاف زبان اس لیے نہیں کھلتی کہ اس کی بصیرت پہ اعتماد ہوتا ہے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کی شاخوں کو بلاوجہ نہیں کاٹتا، ایک کی تراش خراش میں دوسرے کی نشوونما کا راز پوشیدہ ہے، اسے کاٹا نہ جائے، تو وہ بار آور نہ ہو۔ پھولوں کو توڑ کر بازاروں میں نہ لایا جائے تو وہ گل فروش کی دکان کی زینت نہ بن سکیں، اور ان کے لیے کسی محبوب کا دامن دراز نہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام بھی ایک سے توڑتے ہیں اور ایک سے جوڑتے ہیں۔ مالی کی تراش خراش چمن بندی کے لیے ہوتی ہے اور انبیاء کا عمل واصلِ حق کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

محبّت کی عطا

دھوبی بعض کپڑوں کو زور سے دھوتا ہے۔ اور بعض کو محبت سے محبت سے دھوئے ہوئے کپڑوں کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ ان سے بوئے محبت آنے لگتی ہے۔ ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی میں بھی اسی لیے مزا ہوتا ہے کہ وہ محبت کی تخلیق ہوتی ہے۔ بینائی کم ہونے کے باعث ماں خراب روٹی پکا دے تو وہ عجیب لذتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسے محبت کے ہاتھ چھوتے ہیں۔ آٹا گوندھتے وقت وہ آٹے میں دل کی محبت بھی گوندھ دیتی ہے۔ جو لقمہ بن کر حلق سے نیچے اترتی ہے، تو اس کی تاثیر اور ہوتی ہے۔ محبت کی پیش کش کو صرف محبت بھرے دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ تحفہ خواہ ہزار میل سے بھیجا جائے۔ روح پہ اثر انداز ہو کر رہتا ہے۔ قبل از وقت اس کی آمد کی خبر ہو جاتی ہے، کیونکہ محبت کا قاصد دنیا کے تمام قاصدوں سے زیادہ سبک رفتار ہے۔

کنعان میں بوئے یوسفؑ کو کس نے سونگھا تھا؟ یہ بوڑھے باپ کی محبت ہی تو تھی، جو سینکڑوں میل سے خوشبو سونگھ کر مبشر بن گئی کہ یوسف کی قمیص آ رہی ہے۔ بشارت کس نے دی؟ اسی محبت نے جو مدتوں سے بیٹے میں بے قرار تھی، جس پہ ہجر کے طویل زمانے گزر چکے تھے۔

اس بحث میں نہ پڑیئے۔ کہ مہ کنعان کو جب کنعان کے کنوئیں میں ڈالا گیا تھا، تو یعقوبؑ کو خبر کیوں نہ ہوئی۔ یہ بحثیں عقل کی ہیں جنہیں محبت کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں عقل نہیں جانتی۔ کہ محبت جب مضطرب ہوتی ہے، تو اپنی کیفیات میں کھو جاتی ہے، اسے اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ جب سنجیدگی اور وقار کی منزل میں آجاتی ہے تو دیکھتی بھی ہے اور سنتی بھی ہے۔ کنوئیں میں گرے ہوئے یوسفؑ کے حال سے بے خبری۔ یعقوبؑ کی محبت کا اضطراب تھا۔ وہ کیا دیکھتی اور کیا سنتی؟ وہ تو اپنے ہی حال میں گم تھی۔ محبت میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تو بو بھی آنے لگی۔ اور اطلاع بھی ملی، ایک حال محبت کی مدہوشی کا تھا، اور ایک معارفِ آگاہی کی ساعتیں۔

شاید قدرت کو بھی بوڑھے باپ کی پریشانی منظور نہ تھی۔ اسی لیے باپ اور بیٹے کے درمیان یعقوبؑ کی محبت کو پردہ بنا دیا تا کہ وہ مہ کنعان کا اضطراب نہ دیکھ سکے۔

مہ کنعان جب کنوئیں اور قید کے حجابات سے نکل کر مصر کے اُفق پر جلوہ گر ہوا۔ تو خود بخود قمیص کی بو آنے لگی۔

اضطراب کی جو ساعتیں بسا اوقات محجوب ہوتی ہیں درحقیقت وہ بھی کرم ہوتی ہیں۔ وقت آنے پر پردے بھی اٹھتے ہیں، بو بھی آتی ہے اور جمال بھی دکھائی دیتا ہے لیکن مشاہدے کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے یعقوبؑ کا حوصلہ چاہیئے۔ تھڑ دِلا انسان کیا بو سونگھے گا اور کیا جمال دیکھے گا۔ یہ تو اضطرابِ شوق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شوق کی تکمیل کے بعد اپنے گم گشتہ یوسف کی تلاش کے لیے کوہ و صحرا میں نہیں جانا پڑتا۔ قمیص خود چل کر آتی ہے۔ پیغام یوسفؑ بھیجتا ہے۔ پھر ملاقات کے شوق کا اِدھر سے نہیں، اُدھر سے اظہار ہوتا ہے۔ پیام بھی آتے ہیں اور تحفے بھی۔

حسن اور آئینہ

جو چیز دوسروں کے لیے مفید ہو، اُسے اسی نسبت سے اداہمیت دی جاتی ہیں جنگل کے پھول میں وہ بات نہیں ہوتی جو باغ کے پھول میں ہوتی ہے باغ کے پھول کی دلکشی اور رعنائی جاذبِ نظر بھی ہوتی ہے اور دل نواز بھی! جنگل کا پھول

ان صفات سے عاری ہوتا ہے۔ جو پرندے زیادہ بچے پالتے ہیں انہیں پر بھی زیادہ ملتے ہیں۔ جنگلی بکریوں کے تھنوں میں دودھ نہیں ہوتا۔ اس نعمت سے وہی جانور نوازے جاتے ہیں جنہیں دوسروں کی ضرورتوں کا کفیل بنایا جاتا ہے۔

نعمتوں کی طلب ہو تو دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے جذبات سے دل لبریز ہونا چاہیے۔ جو بچہ فطرتاً سخی اور کریم ہو، اور ماں باپ سے نعمت پانے کے بعد بہن بھائیوں میں تقسیم کر دے، وہ مزید کا حقدار بنتا ہے۔ ماں کی مامتا اسے محروم دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ دوسرے بچوں کی نسبت اسے زیادہ ملتا ہے، اور رحمت کی نظریں اور شفقت بھرے جذبات اس پر مستزاد ہوتے ہیں۔

رب تعالیٰ کی عادت بھی یہی ہے کہ وہ انسان کو دوسروں کے لیے پریشان و مضطرب دیکھتا ہے، تو اسے سکون کی دولت سے نواز دیتا ہے۔ ایثار کرنے والے اور دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر ترجیح دینے والے کبھی محروم نہیں رہتے۔ محرومی خود غرض انسان کا حصہ ہوتی ہے۔ آفتاب بلا امتیاز اپنا نور بانٹتا ہے۔ چمنستانوں اور غلاظتوں پر سایہ فگن ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی لطافت مجروح نہیں ہوتی، اس کا نور ازل سے دمک رہا ہے اور ابد تک دمکتا رہے

گا، ہوا بھی شریف و رذیل کے لیے ہے۔ اس کی فیاضیوں کا سلسلہ کسی خاص حلقے تک محدود نہیں۔ تمام کو مساوی طور پر مستفیض کرتی ہے۔ وسعتیں جتنی بے کراں ہوں گی، کرم کے جذبات بھی اسی قدر بے کراں ہوں گے۔ تنگ دل اور تنگ ظرف ذات میں بے کراں جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔

رب تعالیٰ کی ذات چونکہ ہر اعتبار سے بیکراں ہے۔ اس لیے اس کے کرم کا سلسلہ بھی وسیع ہے۔ ایک بخیل بادشاہ کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا وزیر دریادل ہے جھولی بھر کر تقسیم کرنے کا عادی ہے، تو اسے برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

کسی ذی عظمت ذات کو یہ معلوم ہو جائے کہ جن عظمتوں کی وہ مالک ہے، انہیں کی جھلک ایک معمولی انسان میں بھی پائی جاتی ہے تو وہ اس پر ہزار جان سے نثار ہو گی۔ ہر حسین اپنی ہی اداؤں کا شکار ہوتا ہے، آئینے سے اس کے غیر معمولی شغف کا اور کیا باعث ہو سکتا ہے کہ اس آئینے میں اپنی ذات نظر آتی ہے، اپنی ادائیں دکھائی دیتی ہیں۔ اسی لیے اسے پیشِ نظر رکھتا ہے۔ سنوارتا ہے، اور ٹھوکروں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ آئینے کو ٹھیس لگ جائے، تو اس کے دل پر چوٹ پڑتی ہے۔

بندہ بھی حسنِ مطلق کا آئینہ ہے۔ اسے اپنی اداؤں کی دلفریبیاں دیکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ذات کریم ہے، جب اس میں کرم

کی خود دیکھتی ہے تو نثار ہونے لگتی ہے۔ آئینہ گدلا ہو جائے، اور اپنی آب و تاب کھو بیٹھے تو حسن کی نظروں میں مرغوب نہیں رہتا اور نہ ہی اسے دیکھ کر حسن کے دل میں کوئی اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ راز و نیاز کا سارا کھیل صرف اسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک آئینہ حُسن کا مظہر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

حق کی سربلندی

حق مغلوب ہو تو بہت کم طبیعتیں اس کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ ہر شخص بلال حبشیؓ اور حبیب رومی کا ہم مذاق نہیں ہوتا۔ تپش و گداز کی نعمت تو ایسی نایاب نعمت ہے کہ جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے حق کو مغلوب اور مصائب و آلام میں گھرا ہوا دیکھ کر جو لوگ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں ان کی فطرت ہی بلند نہیں ہوتی۔ وہ ازل سے عالی حوصلہ لے کر آتے ہیں۔ ورنہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ لوگ ظاہری شان و شوکت کو دیکھتے ہیں۔ جس جماعت اور گروہ سے وابستہ ہوتے ہیں، اس کے متعلق پہلے سے یہ سوچ لیتے ہیں کہ اس سے وابستگی کے بعد انہیں کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں؟ ان کا مفاد کہاں تک محفوظ

رہ سکتا ہے، ذاتی مفاد اسی وقت بھول سکتا ہے۔ جب انسان مبتلا ہو جائے اس پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جائے اور ظاہر ہے کہ خود فراموشی ہر ایک کا حصہ نہیں ہوتی اس کے لیے خاص روحیں درکار ہوتی ہیں۔ ہر پہاڑ برقِ تجلی کا اہل نہیں ہوتا اور ہر سینہ جبریلِ امین کا نشیمن نہیں بن سکتا۔

برق اسی پہاڑ پر گرتی ہے، جسے موسیٰؑ کے قدم نوازتے ہیں۔ جس پر طالب دیدار متمکن ہوتا ہے اور جبریل امین کے جلووں کو وہی روح اپنے اندر جذب کر سکتی ہے جو عشق کی مستی سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ یہ سب قدرت کے عطیات ہیں۔ اور عطیہ ہر ایک کو نہیں ملتا۔ جسے چاہے کریم نواز دے۔

عامۃ الناس کو کسی حقیقت سے آشنا کرنے کے لیے ترغیب و تحریص کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترغیب و تحریص بھی اسی وقت کام دیتی ہے جب حق کے علمبرداروں کی آوازیں جان ہوتی ہے۔ ان کے سینوں کے سوز کی جھلک ان کی عملی زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہو۔ بے سوز صدا ایک دل کو بھی متاثر نہیں کر سکتی اور بے عمل زندگی سے کسی انقلاب انگیز کارنامے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ چند جاں باز اٹھ کر جب کسی حقیقت کا حسن

اجاگر کر دیتے ہیں تو ان کا خلوص دوسروں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔
حضور علیہ السلام کی مکی زندگی میں جو صحابہؓ کفار کی غلامی میں گرم ریت پر
تڑپ رہے تھے۔ مکہ کی فضاؤں میں گو ان کی صدا بے اثر تھی لیکن
جب یہی دیوانے مدینے میں جمع ہو گئے اور انہوں نے اپنی تگ و دو سے
خود کو منظم کر لیا تو ان کا عشق رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا۔ غلامی کی زندگی
میں انہوں نے جس جذب و شوق کا اظہار کیا تھا، اسی کے باعث
کفار ان کے متعلق اپنا نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے کہ صحابہؓ کی صورت
میں اسلام کی جو قوت ایک مرکز پہ جمع ہو گئی ہے اس کا مقابلہ نہیں
کیا جا سکتا اور جب صحابہؓ نے اپنی جاں بازیوں سے غلبہ حاصل کر لیا،
قریشِ مکہ کے بہادروں کے عزائم کو شکست دے دی تو اس حقیقت
کا حسن نکھر کر سامنے آگیا جس کے وہ داعی تھے جس کی طرف قریش کو بلا رہے تھے
اسلام کے علمبردار اگر اپنی اولوالعزمی سے اسلام کی صداقت کا لوہا
نہ منوا لیتے تو قریش کی آنکھیں کہاں کھل سکتی تھیں اور وہ حسن صداقت
کا نور کہاں دیکھ سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کی مکی زندگی میں نہایت
محدود تعداد ایمان لائی۔ اور مدنی زندگی میں ہمیں یدخلون فی
دین اللہ افواجا کا منظر نظر آرہا ہے۔ حالانکہ نبوت کی مدنی زندگی
کی مدت قلیل ہے مکہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار اس لئے محدود

رہی کہ اسلام غریب تھا کمزور تھا اور اسے وہ قوت و طاقت حاصل نہ تھی جو کسی نظریہ کو پھیلانے اور عام کرنے کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے اور مدینے میں یہ شان و شوکت حاصل تھی۔

زندگی کا مقصود

بچے کا شعور خام ہوتا ہے تو اس کی نظر کھلونوں تک محدود رہتی ہے لاکھوں کا چیک کاٹ کر دیدیا جائے تو وہ مطمئن نہیں ہوتا۔

انسان بھی جب اپنی تخلیق کے مفہوم سے ناآشنا ہوتا ہے اور اسے ذہنی بلوغ حاصل نہیں ہوتا تو وہ خام تمناؤں کے جال سے نہیں نکل سکتا، اس کی ہر آرزو خام ہوتی ہے۔ ہر طلب ناقص ہوتی ہے۔ ساری زندگی آرزوؤں اور تمناؤں کے قصر و ایوان تعمیر کرتے، گذر جاتی ہے اور حیات کا وہ مقصد نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ خدائے تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہو تو انسان کو بلند نگاہ عطا ہوتی ہے۔ بلندیاں ہی اس کے فکر و خیال کا محور و مرکز بن جاتی ہیں، خام آرزوؤں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کی بجائے وہ اسی راہ کو اپنے لیے پسند کرتا ہے جس کا منتہا رضائے الٰہی ہو۔ بچہ کھلونوں سے مطمئن ہو سکتا

ہے لیکن ایک عاقل و بالغ انسان کو کھلونوں کی چمک دمک متاثر نہیں کر سکتی۔ دنیوی حیات کیا ہے؟ لہو و لعب، کھیل تماشا، یہاں ایک پردہ اٹھتا ہے اور ایک گرتا ہے۔ ایک منظر نگاہوں کے سامنے آتا ہے اور اپنی سحر کاریوں کی شان دکھا کر غائب ہو جاتا ہے، اس کی جگہ کسی دوسرے منظر کی حیرت زائی لے لیتی ہے۔ حیرت زائیوں اور طرفہ کاریوں کا یہ طلسم تاحیات نہیں ٹوٹتا۔ ہر منظر کی علیحدہ شان ہوتی ہے اور ہر تماشے کی الگ حیثیت۔

زندگی کا مسافر دنیا میں تماشائی کی حیثیت سے نہیں آیا۔ اور نہ ہی اس کے اوقاتِ عزیز ایسی بیکار باتوں کے لیے وقف ہو سکتے ہیں۔ اس کی حیات کا ہر لمحہ گراں قدر ہے۔ کائنات کی ساری دلچسپیاں بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتیں جو سانس یادِ الٰہی میں صرف ہو۔ کونین کی نعمتوں سے افضل ہے۔ دنیا کی ہر نعمت کا کوئی نہ کوئی بدل ہو سکتا ہے لیکن عالمِ موجودات کی تمام نعمتوں کو دے کر بھی ہم اپنی حیات کے ایک سانس کو واپس نہیں لوٹا سکتے۔

ہر سانس خدا کی امانت ہے اور یہ امانت منعم کی منشا کے مطابق صرف ہونی چاہیے۔ حیات کا جو لمحہ اپنے خالق و مالک کی منشا کے مطابق صرف ہو، خواہ وہ کس قدر بھی اذیت ناک اور پریشانیوں کا حامل

کیوں نہ ہو، دونوں جہاں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ مسرتوں میں گزری ہوئی زندگی خواہ کتنی بھی سکون آمیز اور بہجت خیز کیوں نہ ہو۔ اگر وہ غفلت میں گزری ہے، اس میں اپنے مولیٰ کی یاد کی توفیق نصیب نہیں ہوئی، حیات کی نعمت جس غرض کے لیے تفویض ہوئی تھی وہ اس سے روشناس نہیں ہو سکی تو وہ بیکار ہے۔

عقبیٰ کی زندگی میں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ دنیا میں رہ کر حیات کا دامن کس قدر مسرتوں سے بھرا؟ کتنی خوشیاں حاصل کیں؟ وہاں تو صرف یہ سوال ہوگا کہ کس قدر حسنات سمیٹ کر لائے ہو؟ جن راہوں سے بچنے کی تعلیم دی گئی تھی، ان سے کس قدر دامن بچایا؟

جو غم انسان کو اپنے مولا سے قریب کر دے وہ اس خوشی سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے جس کا نشہ غافل اور مدہوش بنا دے۔ زمین و آسمان کی مالک و مختار ذات خود بیدار ہے اور وہ بندے سے بیداری چاہتی ہے غفلت اسے پسند نہیں اور غافل دل اس کی محبت کی بو نہیں سونگھ سکتے۔ بیداری خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں کو ملتی ہے اور غفلت ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہے جن کے مقدر میں محرومی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بدن کی راحت کے لیے لاکھ جتن بھی کیے جائیں خدا کی بارگاہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اِلّا یہ کہ دل کی بیداری بھی پیشِ نظر ہو۔ حیات کے تحفظ و بقا

کے لیے جدوجہد کرنے وقت۔ اگر انسان دل کی بیداری کو نظر انداز کر دے تو اس کی حیثیت اس بچے سے مختلف نہ ہو گی جو کھلونوں کی چمک دمک میں کھو کر رہ جائے اور اس کی نگاہ اس سرمائے پر نہ ہو جو اس کی حیات کو خوشگواریاں عطا کرنے کا ضامن بن سکتا ہے۔

اضطراب اور سکون

انسان اپنی بداعمالیوں سے اسی دنیا کو اپنے لیے جہنم بھی بنا سکتا ہے، اور یہی دنیا اس کے لیے جنت کا نمونہ بھی بن سکتی ہے۔ جو کچھ ہمیں پیش آتا ہے، وہ ہمارے ہی اعمال کا ثمر ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں کو جو ناگواری پیش آتی ہے وہ ان کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ ان کا امتحان ہوتا ہے، جو انہیں خدا تعالیٰ کے اور زیادہ قریب کر دیتا ہے، اور ہماری ناگواریاں اور ہماری شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مقبول بندوں کا امتحان ان کی عظمت کو واضح کرنے کے لیے ہوتا ہے اور مردود کی مردودیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

جنت اور دوزخ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک خدا کے قہر و غضب کا مقام ہے، اور ایک لطف و کرم کی جگہ جہاں وہ سب کچھ موجود ہو گا

جس سے چشم و گوش اور قلب و روح لذت یاب ہو سکیں گے۔ وہاں احساسات ظاہری اور احساساتِ باطنی کی تسکین کا سامان موجود ہوگا۔ اور دوزخ میں ظاہر و باطن دونوں کو انعاماتِ ربانی سے محروم رکھا جائے گا۔ یہ بات مُسلّمات کا درجہ رکھتی ہے کہ اضطرابِ روح سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ ایک انسان راحت کے سامان ہونے کے باوجود بھی اگر روحانی تسکین سے محروم ہے اور اضطرابِ روح میں مبتلا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہے اگر کچھ نہ ہونے کے باوجود روح کو تسکین حاصل ہے تو یہ خدا تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔

خدا تعالیٰ قادرِ مطلق ہے جس طرح وہ راحت کے سامان کے ذریعہ راحت پہنچانے پر قادر ہے، ایسے ہی راحت کے سامان نہ ہونے کے باوجود بھی راحت پہنچا سکتا ہے۔ ایسے ہی وہ دوزخ کے ذریعہ بھی عذاب دے سکتا ہے، اور دوزخ کے بغیر بھی عذابِ الیم میں مبتلا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس لیے ہمیں مال اور اولاد طلب کرتے وقت یہ دعا کرنی چاہیئے کہ یہ مال و اولاد ہمارے لیے فتنے کا موجب نہ بن جائیں۔ ہمیں زندگی کے سکون سے محروم نہ کر دیں، اور ہماری نگاہوں سے وہ مقصد اوجھل نہ ہو جائے۔ جس کے لیے ہماری تخلیق ہوئی ہے۔ تخلیق کا مقصد جاہ و مال کا حصول ہی نہیں۔ یہ چیزیں

تو فرعون و ہامان اور شداد و نمرود کو بھی حاصل تھیں، لیکن وہ زندگی کی ان راحتوں سے محروم تھے، جو خالصتاً خدا تعالیٰ کے اطاعت گذار اور فرمانبردار بندوں کا حصہ ہوتی ہیں۔ ابو جہل کو نرم و گداز بستر پہ وہ سکون حاصل نہ تھا، جو ابوذر غفاریؓ کو اپنی پھٹی پرانی گدڑی میں مل رہا تھا۔ ابو جہل کے تر لقموں کو ان سوکھے ٹکڑوں سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، جو صحابہؓ کو بارگاہِ نبویؐ سے مل رہے تھے۔

محبت کی عطا میں یہ تاثیر ہے کہ وہ جزوِ بدن بننے کے بعد خیبر شکن بن جاتی ہے، مُردوں پر نظر ڈال دے تو ان میں زندگی کا تازہ خون دوڑنے لگتا ہے۔ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا ہوا مال چہرے پر سرخی تو لا سکتا ہے، لیکن اس میں مردوں کو زندگی بخشنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، وہ تو خون بننے کے بعد جسم و جان کو سکون سے محروم کرے گا، اس کے ذریعہ جو فاسد مادہ پیدا ہو گا، وہ خدا تعالےٰ کے عذاب کو دعوت دے گا۔ حیات میں انتشار پیدا کرے گا اور اس ملت کے لیے رسوائی کا موجب بن جائے گا، جو اس سے منسوب ہو گی۔ سکون حلال کا مال بخش سکتا ہے اعجاز نمائی کی شان اسی لقمے میں پیدا ہو گی جو خدا تعالیٰ کے فرمانبردار بندے کی رگوں میں خون بن کر دوڑے گا، خواہ وہ کتنا ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو

عطا اور بلا

زندگی میں انسان کو تین حالتیں پیش آسکتی ہیں۔

ایک یہ کہ آسودہ حال ہو اسے کوئی ناگواری پیش نہ آئے، جو آرزو کرے وہ پوری ہو جائے۔

یہ حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں خود سر اور متکبر بن کر بھٹکنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اور شکر گذار بننے کی کم امید ہوتی ہے۔ فرعون کو اس کی کامیابیوں نے فرعون بنا دیا تھا۔ مفلس ہوتا تو کبھی خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کی بعض آرزوئیں پوری ہوں اور بعض پوری نہ ہوں۔ رنج و غم اور عیش و آرام زندگی کے ساتھ ساتھ رہیں۔ کبھی ارمانوں کے خیابانوں میں بہار آجائے اور کبھی آرزوؤں کے چمنستان اُجڑتے دکھائی دیں، یہ دھوپ چھاؤں حیاتِ انسانی کے لیے مفید ہوتی ہے۔ یاس کا اندھیرا بھی عجز کی شان پیدا کر کے بندے کو مولا کے قریب کر دیتا ہے اور مسرت کی چاندنی بھی عرفانِ حیات بخشتی ہے غم میں انسان صبر کے اجرِ جزیل کا مستحق بن سکتا ہے اور مسرت شکر کی

طرف رہنمائی کرے گی۔ صبر اور شکر دونوں متوسط حالت کے ثمرات ہیں۔

تیسری حالت ابتلاء و امتحان کی ہے۔ اس حالت میں ہر انسان ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ مایوس ہو کر خدا سے کٹ جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ایوبی شان حضرت ایوب علیہ السلام کا حصہ تھی۔ اور حسینؑ کا صبر انہی کے شایانِ شان تھا۔ ظاہر ہے خاصانِ بارگاہ کی میراث عوام کو نہیں ملتی خواص ہی اس کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے ایسے ابتلاء و امتحان سے بھی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ جس کی انسان استطاعت نہ رکھتا ہو۔ غرض نہ وہ تمول بہتر ہے جو عجز و نیاز سے بے نیاز سے بے نیاز کر دے اور نہ فقر و فاقہ کی وہ زندگی جو سراسر ابتلاء و امتحان ہو۔

بیچ کی راہ اعتدال کی راہ ہے اسی میں رہ کر انسان صابر بھی بن سکتا ہے اور شاکر بھی مصیبت پر صبر کرنا توفیقِ ربانی کے بغیر ممکن نہیں چہ جائے کہ انسان شکر کرنے لگے مصیبت پر سجدۂ شکر ادا کرنا خاندانِ نبوت کا شیوہ ہے۔ یا ان لوگوں کو یہ سعادت نصیب ہو سکتی ہے۔ جو میراث نبوت پانے کے اہل ہوں ما و شما کے لیے تو بعض حالتوں میں صبر کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

حضرت شفیق بلخیؒ کی محفل میں ایک دفعہ کا شکر کا مضمون چھڑ گیا۔ ایک بزرگ نے کہا کہ ہم لوگوں کا معمول یہ ہے کہ مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں۔ نہیں ملتا تو شکر کرتے ہیں۔

شفیق بلخیؒ نے فرمایا۔ بلخ کے کتوں کا بھی یہی حال ہے مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں ورنہ مالک کے دروازے پر صبر کیے پڑے رہتے ہیں۔

نو وارد بزرگ نے حیرت سے پوچھا "بلخ کے عارفین کا کیا معمول ہے؟"

"شفیق بلخیؒ بولے" یہاں یہ رواج ہے کہ مل جاتا ہے تو بانٹ دیتے ہیں نہیں ملتا تو شکر کرتے ہیں" عطا پر شکر آسان ہے لیکن بلا پر شکر بہت مشکل ہے۔ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی کہہ کر سر تو وہی پیش کر سکتا ہے جو قتیلِ ناز بننے کی لذت سے واقف ہو۔ شہیدِ ناز بننے کی لذت کی حقیقت سے ہر شخص کو آگاہی کہاں دی گئی ہے۔

بلا پر شکر کی ہمت نہ ہو تو پھر عطا کی آرزو ہونی چاہیے، عطا بھی ایسی جو انسان کو غافل نہ بنا دے۔ مولا سے رشتہ توڑنے کا موجب ثابت نہ ہو بلکہ تعلق میں اور زیادہ استواری پیدا کر دے اور ظاہر ہے کہ وہ ایسی ہی عطا ہو سکتی ہے جس کے ساتھ کچھ آزمائشیں بھی ہوں کچھ ناگواریاں بھی ہوں ورنہ انسان کے فرعون بننے کا اندیشہ ہے۔

بلا جو صورتاً بلا ہوتی ہے حقیقتاً وہ بھی عطا ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ حکیم حاذق کی کڑوی گولیاں بھی شفا بخش ہوتی ہیں وہ چرائتہ بھی پلا دے تو آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے۔

تلاش اور جستجو

دامن میں غلاظتیں سمیٹنے کے بعد کوئی شخص خوشبو کی آرزو کرنے لگے تو اس کی یہ کوشش بیکار ثابت ہو گی۔ خوشبو کی طلب ہو تو غلاظتوں سے کنارہ کش ہونا پڑے گا، ان چمنستانوں اور خیابانوں میں سکونت اختیار کرنی پڑے گی۔ جہاں رنگا رنگ کے پھول کھلے ہیں۔ غلاظت لے کر کوئی باغ میں چلا جائے تو پھولوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔ خوشبو سے استفادے کے لیے دامن کا غلاظتوں سے پاک ہونا ضروری ہے، ورنہ خوشبو مزا نہ دے گی۔ چمن کی رنگا رنگی دل میں کوئی نشاط کا جذبہ پیدا نہ کر سکے گی۔ روح کو ان کیفیتوں سے آشنا نہ کر سکے گی جنہیں پھولوں کا فیضان کہا جا سکتا ہے۔ ایک ذات سے فیضان حاصل کرنے کے لیے اس کی مخالفت اور متضاد ذات سے رشتہ منقطع کرنا پڑتا ہے۔

سردی اور گرمی، بہار اور خزاں، شگفتگی اور پژمردگی، رنج اور راحت، اضطراب اور سکون، نور اور ظلمت، غم اور خوشی اور اسی کی متضاد اور مختلف کیفیتوں سے بیک وقت استفادہ ممکن نہیں ہوتا۔ دھوپ سے

بچنے کے لیے درخت کے سائے میں آنا پڑتا ہے۔ ظلمتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے نور کی طلعتیں درکار ہوتی ہیں۔ خوشی کے جذبات غم سے نجات کے بعد ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ بہار کی شادابیوں کے لیے فصلِ گُل کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ثواب کی لذت درکار ہو تو گناہوں سے اجتناب کرنا پڑے گا۔ خدا کی رحمت کی طلب ہو تو عتاب کے مقامات سے گریز کرنا لازمی ہو گا۔ لق و دق صحرا میں پھول نہیں کھلتے تنگ و تاریک کمروں کی ظلمتوں کو منور کرنے کے لیے آفتاب نے کبھی اپنی وضع نہیں بدلی، دمکنا اور منور کرنا ازل سے اس کا شعار ہے۔ لیکن اس سے متفیض ہونے کے لیے ان مقامات کو خیرباد کہنا پڑتا ہے جہاں ظلمتوں کا بسیرا ہو۔ اور نور کے پہنچنے کیلئے تمام راہیں مسدود کر دی گئی ہوں تنگ و تاریک کمرے کو منور کرنے لیے اس دیوار کا توڑ منہدم کر دینا ضروری ہوتا ہے جو آفتاب اور کمرے کے درمیان حد فاصل بنی ہو۔ دل اسی وقت انوارِ الٰہیہ سے منور ہو سکتا ہے جب غفلت کے دبیز پردوں کو چاک کر دیا جائے۔ والہانہ دعا کی اثر آفرینی سے انکار نہیں لیکن انسان اگر اپنی وضع نہ بدلے تو مشیت اس کے ارادوں کی پابند نہیں ہو سکتی۔ دعا کے ذریعے سورج کو تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں محصور نہیں کیا جا سکتا، سورج اپنے وقت پہ نکلے گا اور ڈوبے گا۔ جلووں کی طلب ہے کہ کوئی سورج کے

سائے میں آجائے تو منور ہو کر رہے گا۔ جلووں کی طلب موجود ہو تو سورج کے سائے میں آنا پڑے گا، ظلمتوں کے اس حصار کو توڑنا پڑے گا، ظلمتیں جو محرومیوں کا باعث ہیں۔ خدا کی رحمتیں اس انسان کو نوازتی ہیں جو رحمت کا طلب گار ہو کر ان کی تلاش و جستجو میں نکلتا ہے۔ تلاش و جستجو جب حدِ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خدا کی رحمتیں خود بندے کی تلاش میں سرگرمِ عمل نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن یہ مقام اور مرتبہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا یہاں صدیق دل درکار ہوتے ہیں جو تپش و گداز کی نعمت سے مالا مال ہوں۔ طلب حد سے فزوں ہو جاتی ہے اور بیچارگی قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تو قدرت اپنے قوانین بدل ڈالتی ہے، ہاجرہؓ کے سینے کا سوز معصوم بچے کے قدموں میں پانی کا چشمہ بن کر ابلنے لگتا ہے، اور ایک دنیا اس سے سیراب ہوتی ہے، ایک صدیق دل کی طلب بسا اوقات دوسروں کے لیے بھی پیامِ رحمت ثابت ہوتی ہے، اور ایک شقی کی شقاوت دوسروں کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ قدرت کے کرشمے ہیں، طلب کے مظاہر ہیں اور ایسی ندرت کاریوں سے انسان اپنے لیے سامانِ بصیرت فراہم کر سکتا ہے۔

عظیم سہارا

خدا تعالیٰ کی راہ میں بندہ جب اخلاص مندی سے قدم اٹھاتا ہے تو اس پر عرفان و آگہی کی راہیں کھلنے لگتی ہیں۔ ناہموار راستے خود بخود ہموار ہونے لگتے ہیں اور رحمتِ خداوندی بڑھ کے اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ لیکن یہ منصب ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا جو دل یقین کی دولت سے مالا مال ہوں خوارق کا ظہور بھی انہی کے لیے ہوتا ہے۔ ظاہر بین معجزات کا انکار کرتے ہیں لیکن محبت بذاتِ خود معجزہ ہے۔ بدر و احد اور خندق میں جن عجائباتِ قدرت کا ظہور ہوا وہ صحابہؓ کی محبت کی کرشمہ سازیاں ہی تو تھیں۔ صحابہؓ کو حضورؐ کی ذات سے یہ عشق نہ ہوتا۔ وہ حضورؐ پر جان و دل سے فریفتہ نہ ہوتے اور ان کی رگوں میں محبت موج زن نہ ہوتی تو دنیا کو وہ حیرت انگیز مظاہر دیکھنے کیسے نصیب ہوتے۔ جن کی یاد بھی دلوں میں زندگی پیدا کر دیتی ہے۔ صدق و اخلاص کی دولت سے معمور دل ہمیشہ دوسروں کے لیے بھی طمانیت کا موجب ثابت ہوتے ہیں۔ ریب و شک سے یقین کی دولت ہاتھ نہیں آتی، کلی اعتماد کسی ذات سے کامل وابستگی کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جس ذات سے محبت نہ ہو اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔ اعتماد نتیجہ ہوتا ہے کامل محبت کا۔ اسی

لیے ایمان کو محبت قرار دیا گیا ہے اور محبت کے بغیر ایمان کی حیثیت ایک بے
جان قالب کی ہے بدن میں جان نہ ہو تو حرکت [illegible] ہو سکتی۔ انسان نہ دیکھ
سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔ کفار کو مردہ کیا گیا ہے تو اسی لیے کہ وہ ایمان
کی دولت سے محروم ہیں۔ ان میں خدا اور رسولؐ کی محبت نہیں۔ ورنہ جس
چیز کو اہلِ دنیا زندگی سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی تو ان میں کوئی کمی نہیں۔ وہ
کھاتے پیتے بھی ہیں اور چلتے پھرتے بھی ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ وہ محبت کی
بو سونگھنے سے قاصر ہیں۔ اسی لیے چون وچرا میں پڑے رہتے ہیں۔ محبت
چون وچرا نہیں جانتی، وہ مشکلات سے گزرنے کے بعد بھی صدیق رہتی
ہے۔ اس کے پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ محبت کا ہر قدم اعتماد کے ساتھ
اٹھتا ہے اور اعتماد کے سہارے ہی محبت واصلِ منزل ہوتی ہے۔
محبت کی راہ میں مشکلات کے دریا تو ہیں لیکن ریب و شک کے دلدل
نہیں، ریب و شک کے دلدل عقل کی وادی میں ہوتے ہیں جو ٹٹول
ٹٹول کر چلتی ہے۔ اندھے کی رفتار اور بینا کی رفتار میں فرق ہوتا ہے ایک
کو اپنے قدم پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ منزل نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے
ایک کے قدم میں بھی اعتماد ہوتا ہے اور منزل بھی نگاہوں میں ہوتی
ہے۔

جو لوگ عقل کی رہنمائی میں آخرت کا سفر طے کرنے کی کوشش کرتے

ہیں ۔ان کی مثال اندھوں سے مختلف نہیں ہوتی ۔ نادیدہ راہوں میں قدم قدم پہ بھولنے بھٹکنے کے امکانات موجود ہوتے ہیں ۔خدا تعالیٰ کی محبت ایک نور ہے جسے رہنما بنا لیا جاتا ہے، تو بھولنے بھٹکنے کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں ۔ بچہ جب ماں کی گود کی طرف لپکتا ہے، تو گر بھی جاتا ہے ۔لیکن اس کی اعتماد ماں کی محبت کو متحرک کر دیتی ہے اور وہ بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے ۔ سہارا ہمیشہ محبت دیتی ہے ۔عقل کیا سہارا دے گی ؟ وہ تو خود سہاروں کی تلاش میں ہوتی ہے ۔خدا تعالیٰ کی محبت کا سرمایہ دامن میں موجود ہو تو یوں کہئے کہ سہارا موجود ہے ہر جگہ یہ سہارا کام دے گا ۔ اور اگر ٹھوکر لگی بھی تو محبت بے قرار ہو کر سنبھالنے آ جائے گی ۔

صدیق اور زندیق

صدیق اور منافق میں یہ فرق ہے کہ منافق کسی نظام کا وہیں تک ساتھ دے سکتا ہے ،جہاں تک اسے یہ یقین ہو کہ اسے اس تعاون میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ۔ بلکہ قدم قدم پر فوائد و ثمرات حاصل ہوتے رہیں گے ۔جہاں بھی اسے نقصان کا اندیشہ لاحق ہو وہ نظامِ کار سے دامن بچا کر الگ ہو جاتا ہے ،اور اسے ان مواعید کا ذرہ برابر احساس نہیں

ہوتا جو اس نے کسی نظام کے وفادار کی حیثیت سے کیے ہوتے ہیں۔

صدیق انسان کا طرزِ عمل اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ وہ فوائد حاصل کرنے کے لیے کسی نظام کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ اس کے پیش نظر اس نظام کی بہبود ہوتی ہے، جسے اس نے صدیق انسان کی حیثیت سے قبول کیا ہوتا ہے۔ فائدہ ہو یا نقصان وہ اپنی روش نہیں بدلتا۔ اس کے طرزِ عمل میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بلکہ مصائب و آلام کے طوفان اس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرنے کی بجائے اور زیادہ استواری پیدا کر دیتے ہیں، وہ نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ اٹھتا ہے، اور ان طوفانوں کا منہ پھیر کر رکھ دیتا ہے۔ جو اس کی راہ میں حاصل ہو کر اسے منزل سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا منزل سے دور کرنے کا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں، صدیق انسان کے سامنے اپنا مفاد نہیں ہوتا۔ نظام کی بہتری ہوتی ہے۔ اس نظریۂ حیات کا ارتقا، اسے جان و دل سے عزیز ہوتا ہے۔ جس کی عظمتوں کا پرچم لے کر وہ میدانِ عمل نکلتا ہے۔ عشق و محبت کی راہ، ایثار و قربانی کی راہ ہے۔ ہر نظریہ اپنے فروغ کے لیے اپنے پیرو کاروں کا خلوص چاہتا ہے۔ ایثار کا مطالبہ کرتا ہے، قربانی کا طلبگار ہوتا ہے ایثار و قربانی کے بغیر کوئی مشکل راہ ہموار نہیں ہو سکتی عوام کا سیلاب ہی ایسی بے پناہیوں کا حامل ہوتا ہے، جس کے سامنے کوئی دیوار

نہیں ٹھہرتی۔ ہر دیوار سو ائم کے سیلاب کے سامنے بے کار ثابت ہوتی ہے۔ خواہ وہ کتنی بھی مضبوط اور محکم کیوں نہ ہو۔ منافقین کی یلغار صرف اسی دیوار کی طرف ہوتی ہے، جس کی حیثیت ریت کے انبار سے زیادہ نہ ہو۔ آسانیاں انہیں رہزنی کی دعوت دیتی ہیں اور صدیق انسانوں کی زد میں ہمیشہ چیختے چنگھاڑتے طوفان ہوتے ہیں۔ انہوں نے ان کا منہ پھیرا ہے، انہیں شکست دی ہے، اور انہیں مطیع و منقاد بنایا ہے۔ مصائب و آلام کے طوفان ایک ایسی کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں جو کھرے کھوٹے میں امتیاز پیدا کر دیتی ہے۔ منافقین کو صدیقوں سے جدا کر دیتی ہے۔

حضورؐ کی مکی زندگی مصائب و آلام سے عبارت تھی چاروں طرف قریش کے مظالم کا طوفان منڈلا رہا تھا، اس لیے کسی منافق کو یہ طوفان عبور کر کے حضورؐ تک پہنچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضورؐ تک وہی لوگ پہنچ سکے جو صدیق تھے، جو طوفانوں میں کود نے کا عزم رکھتے تھے اور جن کی طلب اتنی صادق تھی کہ کوئی طوفان اس کی بے پناہی کو کم نہ کر سکا۔ مدنی زندگی کے لیل و نہار اور تھے۔ یہاں اسلام کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع مل گیا تھا، اس پہ زندگی کی راہیں کشادہ ہو چکی تھیں، اسی لیے منافقین کو چور دروازے سے گھسنے کا موقع مل گیا۔ لیکن

غزواتِ نبوی کی حشر سامانیوں نے یہاں بھی صدیق اور زندیق کو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ صدیقوں نے آگے بڑھ کر طوفانوں کو روکا، جان و مال کی قربانیاں دیں اور بدر و حنین کے معرکوں میں اپنے خلوص کا مظاہرہ کر کے ابدی سعادتوں کو حاصل کیا۔ سعادتیں ان کی تھیں اور وہ سعادتوں کے مالک و مختار۔ لیکن زندیق مشکلات کی بے پناہیوں کا سامنا نہ کر سکے۔ وہ ان سعادتوں سے محروم رہے جو صدیقوں کا حصہ ہوتی ہیں۔ زندیق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابتلاء و امتحان میں ذہانت کا سہارا لیتا ہے۔ بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ صدیق دل کا یہ شیوہ نہیں، وہ محبوب کو مشکلات میں گھرا دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہے۔ اور جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ جان دے کر بھی اگر وہ محبوب کی عظمت کا تحفظ کر سکے تو اس سودے کو سستا جانتا ہے۔ ہوس معمولی چوٹ کھا کر تلملانے لگتی ہے اور محبت زخم کھا کر بھی دعا دیتی ہے، وہ مجسم دعا اور تشکر بن جاتی ہے۔ کہ اسے جاں نثاریوں کا موقع ملا۔ جان کا حقیر نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

پکار اور جیت

کافر اور مومن کی زندگی میں یہ بنیادی فرق ہے کہ کافر کی تمام تر توجہ اسباب پر مرکوز رہتی ہے اور مومن خدا کو حاجت روا جانتا ہے۔ اسباب کے فراہم ہونے کے بعد کافر مطمئن ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا تکیہ انہی پر ہوتا ہے۔ مومن نہ اسباب کی فراوانی میں خدا کو بھولتا ہے نہ ہی ان کے فقدان کے باعث کبیدہ خاطر ہوتا ہے۔ ہر حال میں وہ خدا کی نصرت و اعانت کا طلب گار رہتا ہے۔ مایوسی اس لیے اس کے قریب نہیں پھٹکتی کہ اسے خدا کی ذات پہ کامل اعتماد ہوتا ہے۔ خدا کی ذات سے اعتماد اٹھ جانے کا نام کفر ہے اور اعتماد قائم ہو جانے کا نام اسلام ۔۔ کافر کا چونکہ خدا کی ذات پہ ایمان نہیں ہوتا اس لیے وہ اعتماد کی دولت سے محروم ہوتا ہے۔ اعتماد تعلق سے پیدا ہوتا ہے اور تعلق کو محبت جنم دیتی ہے۔ جب محبت ہی نہ ہو تو تعلق کہاں کا اور اعتماد کیسا؟ یہ تو سارے کھیل ہی محبت کے ہیں۔

مصیبت میں انسان الٰہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جس پہ اسے

اعتماد ہو پکارنا ہی تعلق کی دلیل ہوتا ہے۔ دل میں کسی کی محبت نہ ہو تو پکار بن کر زبان پہ نہیں آتی پکارتی بھی محبت ہے اور فریاد رس بن نصرت کے لیے آتی ہے تو وہ بھی محبت ہی ہوتی ہے۔ دل سے کسی کو پکارا جائے تو اس کا براہ راست دل پہ اثر ہوتا ہے۔ محبت کی پکار ظاہری آداب و رسوم کی پابند نہیں۔ دل کی زبان دل سمجھتا ہے اور قلبی کیفیات کے اظہار و بیان کے لیے فصیح و بلیغ الفاظ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ جذبات کے سمندر سے اٹھنے والی ایک موج وہ تلاطم بپا کر دیتی ہے جو کھوکھلے الفاظ سے پیدا نہیں ہو سکتے۔

بچہ کتنی زبانیں جانتا ہے؟ لیکن اس کی پکار ماں کو اس قدر بے تاب کر دیتی ہے کہ سینے میں اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور وہ آغوش رحمت کھولنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ رحمت کی آغوش دلیلوں سے نہیں کھلتی اسے محبت کی پکار کھولتی ہے۔ جو دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہوتے ہیں اور انہیں کھولنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی انہیں محبت کے چند آنسو کھول دیتے ہیں۔ محبت بھکاری بن کر آتی ہے تو محروم نہیں رہتی احساسات کا تار تار جھنجھوڑ دیتی ہے۔ اپنا سارا درد محبوب کے دل میں انڈیل دیتی ہے۔ محبت کا یہ روپ کتنا خطرناک ہوتا ہے، کتنا موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔

میدانِ بدر میں تین سو نیرہ کو کفر کے مقابل کھڑا کرنے کے بعد حضورؐ کی سجدہ ریزیوں کا جو عالم تھا، جس قلق و اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا اور جسے دیکھ کر صدیق اکبرؓ پریشان ہو گئے تھے۔ آخر وہ کیا تھا؟ وہ یہی محبت کا اضطراب تو تھا جو نصرت بن کر سامنے آیا تھا۔

میدانِ حشر میں سارے نبی نفسی نفسی اور حضورؐ اُمّتی اُمّتی پکاریں گے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کو اپنی امت سے جو محبت ہے وہ کسی نبی کو اپنی امت سے نہیں۔ پکار یہاں بھی محبت کی ہوگی اور جیت بھی محبت کی۔

مقبولیّت کی علامات

خدا تعالیٰ کا خصوصی کرم ہوتا ہے تو بندے کو عبادت کی توفیق نصیب ہوتی ہے، توفیق ربانی شاملِ حال نہ ہو، تو عبادت ممکن نہیں ہوتی دنیا کے ذی جاہ اور ذی عظمت لوگ بھی ناپسندیدہ عناصر کو اپنی بارگاہ میں نہیں گھسنے دیتے۔ کسی حادثے کی بنا، پر انہیں باریابی نصیب ہو بھی جائے تو وہ کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ بارگاہ کا قرب انہیں وہ کیف و سرور عطا نہیں کر سکتا جو قرب کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے زبان پر ذکر

آنا بھی ہے تو محض رسمی، جو اور بے مزہ کر دیتا ہے نہ دل ہی سے کوئی تموجِ نشاط اٹھتی ہے اور نہ احساسات ہی میں محبت کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ احساسات میں حرارت تو اسی کا نام زبان پہ آنے سے محسوس ہوگی جو دل میں بسا ہو۔ اس کا نام بھی مزا دے گا اور یاد بھی رگ و ریشے میں بجلیاں بھر دے گی۔ اجنبی کے ذکر سے روح کیا لذت پا سکتی ہے؟ بیگانے کی یاد میں مستیاں کہاں؟

روحانی رشتہ قائم ہو تو یاد بے مزا نہیں ہو سکتی، دوست کا ذکر بھی کیف انگیز ہو گا۔ اور یاد بھی مستیوں اور سرشاریوں کے لامتناہی سلسلے کی خالق بن جائے گی۔ خیال میں بت کدے آباد ہوں، دل بتوں کی جلوہ گاہ بنا ہو تو وحدہٗ لاشریک کے آستانۂ جلال و جبروت پہ سجدہ ریزیوں کے باوجود توحید کا کوئی جلوہ روح و قلب کو تجلیوں اور تابانیوں سے منوّر و مستنیر نہیں کر سکتا۔

ایک سے واصل ہونے کے لیے دوسرے سے کٹنا پڑتا ہے۔ دنیا والوں کو تو ان کے دشمنوں سے تعلق قائم رکھنے کے باوصف اپنی وفاداریوں کا یقین دلا کر دھوکے میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک سمیع و بصیر اور دلوں کے چھپے ہوئے بھیدوں سے واقف ذات کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تو عیاری کی سزا ملے گی۔

مکاری کو بدترین جرم قرار دے کر راندۂ درگاہ ٹھہرایا جائے گا۔ عیار اور مکار انسان کو دنیا والے دھتکار دیتے ہیں تو اسے قریب نہیں پھٹکنے دیتے رب تعالیٰ پھٹکار دے، تو اپنا نام لینے کی توفیق چھین لیتا ہے، اپنی یاد کی لذتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ کسی شخص سے ہمارے تعلقات خراب ہوں، تو ہم اسے اپنی ذات کے لیے سرمایہ صرف کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ضرورت خواہ کتنی بھی شدید ہو، ہماری غیرت دشمن کے سرمایہ سے ہمیں ضرورت پوری کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ رب تعالیٰ جو غنی ہے، جو سرمدی خزانوں کا مالک ہے اور جس کی غیرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اس سے یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے، کہ وہ مبغوض اور راندۂ درگاہ انسانوں کو اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا؛ یہ توفیق تو انہی کو نصیب ہوتی ہے، جن سے محبت کا رشتہ قائم ہو اور انہیں نوازنا مقصود ہو۔ شداد و ہامان اور نمرود و فرعون کے پاس دولت کی کیا کمی تھی؛ لیکن کیا انہیں فلاکت زدہ کی مدد کی توفیق نصیب ہوئی؛ خدا تعالیٰ کی مخلوق کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے افلاس کی آگ میں جلتے دیکھا، لیکن وہ ان کے دستگیر نہ بن سکے۔ ان کی ساری دولت اپنی عشرت کوشیوں کے لیے وقف تھی۔ جو لوگ اب بھی راندۂ درگاہ ہیں، وہ نام و نمود کے لیے اپنا سرمایہ پانی کی طرح بہا دیتے ہیں لیکن یتیموں اور بیواؤں کی خستہ حالی کا ان پر کوئی اثر

نہیں ہوتا۔ احساس کی کوئی تپش محسوس کیے بغیر وہ قریب سے گزر جاتے
ہیں۔ یہ سب مردودیت کی علامات ہیں۔

مقبول ادائیں

سخی کی بارگاہ کے دروازے انہی لوگوں کے لیے کھلتے ہیں، جنہیں دراز تا
مقصود ہوتا ہے تو کوئی کریم ذات نہ گدا کی آواز کو شایانِ توجہ سمجھتی ہے
اور نہ ہی اس کے لیے اپنی بارگاہ کے دروازے کھولتی ہے۔

دروازہ کھلنا کرم کی علامت ہوتا ہے۔ آواز پر توجہ بھی بے مقصد
نہیں ہوتی بوہ منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ گدا کی آواز کا سوز دراصل
سخی کے جذبہ رحم و کرم کا پرتو اور فیضان ہوتا ہے، سخی ملتفت نہ ہو
تو گدا کی آواز میں سوز پیدا نہیں ہو سکتا وہ صدا دے بھی تو بے کیف
ہوگی۔ روح میں کوئی نشہ اور کیف پیدا نہ کر سکے گی۔

صدا کا نشہ اور کیف دل کے نشے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور دل میں
کیف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب دل مطمئن ہو کہ صدا سخی کے دل پر
اثر انداز ہو رہی ہے۔ وہ سن رہا ہے، صدا پر متوجہ ہے۔

سخی کی توجہ گدا کے دل کے یقین و اعتماد سے بھر دیتی ہے یقین سوز بنکر گدا کی آواز میں

ظاہر ہونے لگتا ہے۔ جس سے سننے والے ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ گدا خود مستیوں میں جھومنے لگتا ہے، یہ احساس اسے قطعاً پریشان نہیں کرتا کہ صدا دیتے ہوئے دیر ہو گئی ہے۔ اور ابھی سخی کا کرم عطا کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا۔ اس یقین سے اس کا دل معمور ہوتا ہے کہ عطا کے ظاہر ہونے میں جس قدر تاخیر ہو رہی ہے اسی قدر کرم کا زیادہ مستحق بنتا جا رہا ہوں۔ صدا مردود ہوتی تو اس قدر ٹھہرنے اور مانگنے کی اجازت نہ ملتی۔ فوراً دھتکار دیا جاتا۔ صدا مقبول ہو گئی ہے تو مردودیت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ جب بھی کرم کا ہاتھ اٹھا جھولی بھر جائے گی۔ توقع سے زیادہ عطا ہو گا۔

جو لوگ ازلی مردود ہوتے ہیں انہیں خدا کی بارگاہ سے مانگنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ مانگنے کے لیے کھڑے ہو بھی جائیں تو ان کی آواز میں وہ سوز و درد پیدا نہیں ہوتا۔ جو مقبولیت کی علامت ہوتا ہے۔ یہ سوز و درد صرف انہی کو ملتا ہے جن پر رحمت نثار ہوتی ہے۔ صدا کی مقبولیت عطا کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ صدا مقبول ہو جائے تو گدا بھی مقبول ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تاخیر مضر نہیں ہوتی۔ بلکہ مفید ہوتی ہے۔ صدا میں جتنا وقت گذرتا ہے

وہ اتنا ہی گدا کو مقبولیت کے قریب لانے کا موجب ثابت
ہوتا ہے۔ کرم کی امید جب درد بن کر دل میں سما جاتی
ہے تو صدا بن کر زبان پہ آ جاتی ہے اور انعام بن کر
جھولی میں آ گرتی ہے۔

صدا درد اور انعام یہ سب سخی کے انعامات ہیں۔ سخی نہ چاہے
تو گدا کے سینے میں نہ درد پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ زبان پہ احساسات میں
تلاطم پیدا کرنے والی صدا آ سکتی ہے اور نہ انعام مل سکتا ہے۔ جس
گدا کو صدا کا سوز مل جائے انعام اس کا حق ہوتا ہے۔ درد سے محروم
گدا کی آواز بے اثر ہے۔ اس سے کفالت کی امید نہیں کی جا سکتی۔ کفیل
وہی صدا بنتی ہے جو مقبول و محمود ہو۔ درد مل گیا تو مراد مل گئی۔ صدا تو
صرف حال سے آگاہی کے لیے لگائی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے
ذوق کا غماز کہا جا سکتا ہے تاکہ شکستگی کو آواز میں ڈھال کر سخی کے
کان تک پہنچایا جا سکے۔ جو ذات علیم و خبیر ہو اس کے سامنے اظہار و
بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ قلبی کیفیت سے واقف ہوتی ہے
درد کا اظہار تو اپنے ذوق کی سیرابی کے لیے ہوتا ہے یا یوں کہیئے کہ جام بھر
جاتا ہے تو چھلکنے لگتا ہے یہ کیفیتیں بھی مقبول ہیں کیونکہ مقبول کی کوئی ادا مردود
نہیں ہوتی اور مردود کو مقبول کی ادائیں نہیں ملتیں۔

حدِ لقول کی ضرورت

کسی ذات کی حاکمیت تسلیم کر لینے کے بعد انسان کو اس کے اشاروں کا پابند ہونا پڑتا ہے اسی کی خواہشات و مرضیات کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ذات کے اقتدار کو تسلیم کر لیا جائے، خود کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ لیکن اس کی اطاعت کے بجائے اپنے فیصلے صادر کیے جائیں۔ ایسی اطاعت کو کوئی ذات قبول نہیں کر سکتی انسان جس حکومت کا شہری بن کر زندگی گذارنا چاہے، اس پر اس کی اطاعت لازم ہوگی۔ کوئی حکومت ایسے شہری کو برداشت نہیں کر سکتی جسے شہری ہونے کی حیثیت سے تمام مراعات حاصل ہوں اور وہ کسی دوسری حکومت کے آئین و ضوابط کا پابند ہو، مراعات ایک حکومت سے حاصل کرے اور کسی دوسری حکومت کی اطاعت کو لازمی جانے، ایسے شخص پر بغاوت کا مقدمہ قائم ہوگا، اور اس سے تمام مراعات چھین لی جائیں گی۔

مراعات کے حقدار صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی سرشت

میں وفا ہو، جو حکومت کے مجوزہ قواعد وضوابط کے پابند ہوں، اور ان کا صحیح معنوں میں احترام کرنا جانتے ہوں، مجوزہ آئین و قوانین کی اطاعت کے بغیر اطاعت کا مفہوم واضح نہیں ہو سکتا، جو شخص زبان سے اطاعت کا اقرار کرے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکومت کے آئین و قوانین کے خلاف پراپیگنڈے میں بھی مصروف رہے۔ انہیں ناقابلِ عمل ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اسے کوئی حکومت برداشت نہیں کرے گی۔ خواہ وہ کتنی بھی وسیع القلب اور کشادہ ظرف کیوں نہ ہو، وسیع القلبی اور کشادہ ظرفی کا ہرگز یہ مفہوم نہیں، کہ کسی انسان کو ان نظریات کا مذاق اڑانے کی اجازت دے دی جائے، جو ریاست میں اساسی حیثیت رکھتے ہوں۔ جن پر ملک و قوم کی عظمت کا انحصار ہو، ایسی آزادی نہ کسی قوم نے کبھی کسی فرد کو دی ہے اور نہ ایسی آزادی کے بعد ریاست کا وجود قائم رہ سکتا ہے۔ سلامتی کی راہ یہ ہے کہ انسان کو جو نظریہ حیات پسند نہ ہو، جسے وہ انسانی ترقی کی راہ میں حائل سمجھے یا یہ جانے کہ اسے اپنانے سے انسانی ارتقا۔ رک جائے گا انسانیت کو وہ فوز و فلاح حاصل نہ ہو سکے گی۔ جسے معراجِ کمال کہا جا سکتا ہے تو اس سے واضح طور پر علیحدگی اختیار کرلے۔ یہ طریق کار تو انتہائی غلط اور غیر معقول ہے کہ انسان ایک نظام سے چمٹا بھی رہے، اس کا رکن بن کر فوائد و ثمرات

بھی حاصل کرے اور اس کا مذاق بھی اڑائے۔

اسلام نفاق کو انتہائی خطرناک قرار دیتا ہے، اور اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے، وہ اپنی تعلیم کو جبراً کسی کے سر تھوپنے کی کوشش نہیں کرتا، اسے تو صرف ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جن کے دل صدیق ہوں، جن کے دل ریب و شک کے لیے کوئی گنجائش نہ ہو، جنہوں نے اسلام کو دینِ فطرت سمجھ کر قبول کیا ہو، اور اس کا ہر ضابطہ ان کے نزدیک وحیٔ ربانی کی حیثیت رکھتا ہو۔

شکوک شبہات سے لبریز دل اگر ایک جگہ اکٹھے بھی ہو جائیں تو ان کی کوشش سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ پہاڑوں کو چیرنا، دریاؤں کو عبور کرنا اور صحراؤں کو بوستانوں میں تبدیل کر دینا، عزمِ راسخ کے معجزانہ کارنامے ہو سکتے ہیں، منافقوں نے کب کوئی میدان جیتا ہے، کب قربانیاں دی ہیں، کب تلواروں کی چھاؤں میں رقص کیا ہے؟ انہیں تو ہر مقام پر اپنا ہی مفاد عزیز رہا ہے۔ کسی نظام کے ساتھ وہ صرف اسی وقت تک چل سکتے ہیں جب تک مفادات آندھی کے آموں کی طرح ان کی جھولی میں گرتے رہیں۔ جب بھی ایثار و قربانی کا وقت آئے، وہ بڑی صفائی سے الگ ہو جاتے ہیں۔ یہی ان کی تاریخ ہے، یہی ان کا معمول اور یہی

طریقِ کارِ صدیق بن کر صدق کے فروغ وارتقاء کے لیے میدان میں سر بکف نکلنا صرف صدیق دلوں کا شیوہ ہوتا ہے اور اسلام کو ایسے ہی صدیقوں کی ضرورت ہے۔

حق کی نیابت

تبلیغ و ہدایت چونکہ انبیاءؑ کی میراث ہے اس لیے انسان کو یہ فریضہ سرانجام دینے کیلئے پیمبرانہ صفات کا حامل ہونا چاہیئے، حکمت و تدبر اور للہیت کے جذبات سے عاری ہوکر جو لوگ یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں وہ تبلیغی مقاصد کو فائدہ پہنچانے کی بجائے الٹا نقصان پہنچاتے ہیں۔ حق کی علمبرداری کی پہلی شرط بے غرضی، بے نفسی، حلم اور بردباری ہے۔ حق بات سننے والے کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حق گوئی کا محرک حق پرستی کا جذبہ ہے تو سننے والے کے دل پر اس کا اثر ہوتا ہے ایثار اور قربانی کے جذبات کلام کو تاثیر بخشتے ہیں۔ اور یہی جادو سامع کے دل کی دنیا بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ایثار اور خلوص کے جذبات سے عاری کلام خواہ کیسا بھی اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ کسی دل میں انقلاب پیدا نہیں کرسکتا۔ درد بھرے دل سے نکلا ہوا ایک جملہ بھی کئی دفتروں پر بھاری ہوتا ہے اس

سے شعور احساس و شعور راشہ لیتے ہیں۔ وجدان جھومتا ہے اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے جس شخص کی روح میں خود سوز نہ ہو وہ کسی دل میں کیا سوز پیدا کر سکے گا؟ اضطراب، اضطراب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سوز کو سوز جنم دیتا ہے۔ گداز کو خالق روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ روح کی تڑپ نے جب بھی الفاظ کی صورت اختیار کی ہے وہ روحوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکی اور شقاوت نے کسی شخص کے دل میں کبھی رحم و کرم کے جذبات پیدا نہیں کیے۔ اسے ایثار و قربانی پر آمادہ نہیں کیا۔ ظالم اور جابر انسان کبھی حق کا نقیب نہیں بن سکتا۔ حق کے فروغ کا منصب اس کی دسترس سے باہر ہوتا ہے یہ منصب انہی لوگوں کو ملتا ہے جن کی زندگی ایثار سے عبارت ہو جن کا سینہ جذباتِ عالیہ سے معمور ہو۔

خدا تعالیٰ کی ذات خود کریم ہے، کریم انسان ہی اس کا نمائندہ بن سکتا ہے۔ کسی غلط کار اور جذباتِ عالیہ سے محروم انسان کو کوئی شریف انسان بھی اپنی نیابت کا فریضہ نہیں سونپتا، تو خدا سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ نائبینِ حق انتہائی بردبار، نفسانی خواہشات سے پاک اور رحیم و کریم ہوتے ہیں۔ پیغمبران کے فرائضِ حیات میں ہوتی ہے کہ سختی کا جواب نرمی سے دیں تشدد برداشت کریں۔ اور جو لوگ راہ کھو چکے ہوں انہیں راہ دکھائیں۔

روحانی امراض

بسا اوقات ایک معمولی حادثہ انسان کی زندگی میں عظیم انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ جو سعادتیں جد وجہد سے حاصل نہیں کی جا سکتیں ایک ٹھوکر ان سے واصل کر دیتی ہے۔ ٹھوکر ایک احساس انسان کے لیے بیداری کا پیغام ثابت ہوتی ہے خواہ وہ کتنی بھی خفیف کیوں نہ ہو۔ انسان احساس کی دولت سے محروم ہو تو اسے شدید جھٹکے بھی بیدار نہیں کر سکتے۔ غافل انسان پریشانیوں میں مضطرب تو ہوتا ہے، آفات سماویہ کا شکوہ تو کرتا ہے لیکن محرکات پر غور نہیں کرتا جن کا یہ لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ جو انسان درد کی شکایت کرے اور طبیب کی طرف رجوع نہ کرے، دنیا اسے دیوانہ سمجھتی ہے ایسے ہی جو شخص بداعمالیوں کے اثرات سے کراہ رہا ہو۔ اس کی حیات کا ہر لمحہ سکون کی دولت سے محروم ہو گھر میں عیش وعشرت کے سامان موجود ہوں اور وہ سکون کو ترس رہا ہو تو اسے اس طبیب حاذق کا بتلایا ہوا نسخہ استعمال کرنا چاہیئے جس کا پیغام شفا ہے جو مردہ دلوں کو دوبارہ زندگی عطا کر سکتا ہے۔ کوئی سکون کا طالب بن کر آئے تو اسے

سکون ملتا ہے روحانی کیف و سرور اور مستی کی طلب ہو تو اس کی بارگاہ سے یہ جنس بھی طلب سے سوا ملتی ہے بشرطیکہ طلب خام نہ ہو۔

دنیا کے بازار میں کھوٹے سکے کام نہیں دیتے اور اس بارگاہ میں یقین کا کھوٹ قبول نہیں۔ یقین کی پونجی دامن میں ہو تو فائزِ منزل بنا کر رہتی ہے۔ احساس کی بیداری ان راستوں کو ہموار کر دیتی ہے جو ناقابلِ عبور نظر آتے ہیں۔ بیدار بھی وہی کر سکتا ہے جس کا احساس زندہ ہو اور بیداری بھی اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جس کے احساسات میں زندگی کی رمق موجود ہو۔ احساس ہی مردہ ہو تو بیداری کیسی؟ دل زندہ کرنے کی یوں ہی تاکید نہیں کی گئی۔ جسم توانا ہو تو عوارض کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ جسمانی صحت ان کا مقابلہ کر کے انہیں نیست و نابود کر دیتی ہے۔ ایسے ہی دل زندہ ہو تو روحانی عوارض غالب نہیں آسکتے۔

دل کی زندگی باطنی صحت کی ضامن ہوتی ہے۔ گوناگوں امراض کی آماجگاہ بالعموم وہی جسم بنتا ہے جس کی صحت میں بنیادی طور پر کوئی نقص ہو۔ دل بھی صحت سے محروم ہو تو گوناگوں بیماریوں کا شکار بن جاتا ہے۔ روحانی اضطراب بھی بیماری ہے اسے صحت کی علامت نہیں کہا جا سکتا۔ صحت سکون کی ضامن ہوتی ہے خواہ جسمانی ہو یا روحانی۔

صحابہؓ کے متعلق یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جسمانی عوارض سے پاک تھے۔ عوارض ان پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ بیماریاں ان پر بھی غلبہ کرتی تھیں، لیکن یہ بات پورے وثوق اور اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ روحانی عوارض انہیں کبھی مغلوب نہیں کر سکے خطرناک سے خطرناک موقع پر ان کا خدا سے کبھی اعتماد نہیں اٹھا۔ خدا تعالیٰ سے ہٹ کر ان کی نظریں کبھی غیروں پر مرکوز نہیں ہوئیں۔ جو مشکل انہیں پیش آئی ہے انہوں نے اسے اپنی شامتِ اعمال کا نتیجہ قرار دے کر اپنے اعمال کی درستگی کی طرف توجہ دی ہے، اور ہم ہر ناگواری کو یوں محسوس کرتے ہیں، گویا خدا تعالیٰ نعوذ باللہ ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ہمارے اعمال تو سراسر خیر ہی خیر تھے یہ ناگواری کہاں سے ٹپک پڑی؟

بدپرہیز اور حفظانِ صحت کے اصولوں کو نظر انداز کر دینے والا انسان جب بھی بیمار ہوتا ہے اور اس کے پیٹ میں درد اٹھنے لگتا ہے تو وہ اپنی بدپرہیزی کا اعتراف کرنے کی بجائے بالعموم بیماری کو ایک ناگہانی حادثہ قرار دینے لگتا ہے۔ کبھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اس نے بھی کوئی غلطی کی ہے۔ جس انسان کی زندگی ایک ضابطے کے تحت گزر رہی ہو، وہ علالت کو بداحتیاطی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ روحانی مریض بھی اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے اسے حادثہ قرار دیتے ہیں اور خدا کے نیک بندوں کو کوئی اضطراب

لاحق ہوتا ہے تو وہ اپنا قصور جان کر توبہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

تعلق باللہ

نیت اگر بخیر ہو تو عمل کی کوتاہی بھی قبول ہو جاتی ہے۔ نیت کے بغیر اچھے سے اچھے عمل کی بھی کوئی حقیقت نہیں، جس سکے پر سرکاری مہر نہ ہو، وہ مصنوعی کہلاتا ہے۔ اس کی بازار میں کوئی قیمت نہیں پڑتی۔ سرکاری مہر والا سکہ چل جاتا ہے خواہ کھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ تھوڑی بہت قیمت تو اس کی مل ہی جاتی ہے۔ درخت کی جڑیں اگر زمین سے اکھڑ چکی ہوں تو اس کی شاخیں زیادہ دیر تک سرسبز و شاداب نہیں رہ سکتیں، ان کی بہار عارضی اور رفتنی ہوتی ہے۔ زمین سے رشتہ قائم رکھنے والا درخت پھلوں اور پھولوں سے محروم بھی ہو تو وقت آنے پر پھلوں پھولوں سے معمور ہو کر رہتا ہے۔ لیکن بہار صرف اسی درخت کے حصے میں ہوتی ہے جس کا زمین سے رشتہ استوار ہو۔ جس نے شاخیں کٹ جانے کے بعد زمین سے غذا حاصل کرنا ترک نہ کی ہو، غذا جب رگ و ریشے میں پہنچتی رہتی ہے تو تمام محرومیوں کے باوجود درخت کے بارآور ہونے کی امید قطع نہیں ہوتی، ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ابر رحمت

برسنے لگتا ہے سوکھی شاخوں کو تازگی عطا ہوتی ہے نئی کونپلیں نکلتی ہیں، جہاں ویرانیوں کا ڈیرہ ہوتا ہے وہاں نئی بہاریں مسکراتی نظر آنے لگتی ہیں اور پھلوں سے درخت کا دامن بھر جاتا ہے۔ ایک ایک شاخ سرمستی و نشاط کے عالم میں جھومنے لگتی ہے۔

یہ سب فیضان درخت کے اس استحکام کا نتیجہ ہوتا ہے، جو اسے محرومیوں کے باوجود زمین سے حاصل رہتا ہے۔ زمین سے رشتہ منقطع کر لینے کے بعد درخت کے سرسبز و شاداب ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

حیات کا دامن بھی شادابیوں سے اسی وقت بھر سکتا ہے جب پھلوں اور پھولوں سے محرومی اور زندگی کے اثمار سے تہی دامنی کے باوصف انسان کا اپنے مولا سے تعلق نہ ٹوٹنے پائے۔ اس کے دل پر یاس کا غلبہ نہ ہو۔ احساس یہی رہے کہ بادل اب برسے، بس مست گھٹاؤں کے اٹھنے کی دیر ہے۔ اب کے برسیں تو ماضی کی تمام محرومیوں کی تلافی ہو جائے گی۔

اپنے رب سے ایسا تعلق قائم کر لینے والا انسان کبھی محروم نہیں رہتا۔ بادل آتے ہیں، اور برستے ہیں، رحمت کی گھٹائیں اٹھتی، اور تلخیوں کو مٹا کر رکھ دیتی ہیں، مینہہ برستا ہے تو گرد آلود پتوں کا منہ دھل جاتا

ہے خدا کی رحمت کا مینہہ برسنے لگتا ہے تو حیات کا سارا گرد غبار دھل جاتا ہے
انسان کے چہرے پر آلام کی گرد باقی نہیں رہتی۔

ماتم مصائب و آلام کا نہیں ہونا چاہیے۔ اس عدم تعلق پر خون کے آنسو بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بندے اور مولا کو جدا کر دے۔ قابلِ ماتم جدائی ہوتی ہے، وصال نہیں، وصال کی کلفتیں بھی جدائی کی راحتوں سے وقیع ہوتی ہیں اور جس کی یاد سے سینہ معمور ہو، رگ رگ میں اس کی بو بسی ہو، اس کے جمال کا تصوّر روح کو تازگی عطا کر رہا ہو، دل میں جذبات کے نئے نئے طوفان اٹھ رہے ہوں اور اشکوں کی رم جھم میں اس کے جمال کی رعنائیاں نظر آ رہی ہوں، وہ دُور کہاں ہوتا ہے؟ وہ تو شہ رگ سے بھی نزدیک ہوتا ہے، دوری تو اس ذات سے متصوّر کی جا سکتی ہے۔ جس کی یاد بھولے سے بھی نہ آئے۔ یاد آئے بھی تو کوئی مزا نہ دے۔

مزا تعلق کی علامت ہوتا ہے۔ بے مزہ یاد کو بھی تعلق کی علامت کہا جا سکتا ہے؟

تعلق کا فیضان کیف و سرور ہوتا ہے اور بے تعلقی کا بے کیفی اسی سے بندہ مولا سے اپنے تعلق اور عدمِ تعلق کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

خشیتِ ربّانی

مومن کو ہر مقام پر خدا سے ڈرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حالات خواہ کیسے بھی کیوں نہ ہوں، اسے یہی تاکید کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اسی سے استعانت طلب کرے اور اسی کے بتائے ہوئے رستے پر گامزن ہو رہے۔ خدا کی راہ میں جو ہزیمتیں پیش آئیں اسلام کی نگاہ میں وہ ان کامیابیوں پر فضیلت رکھتی ہیں جو ایک انسان کو شیطان کی راہ پر چل کر حاصل ہو سکتی ہیں قرآن ان تمام انسانوں کی زندگی کو ناکام قرار دیتا ہے جو خوش حال ہونے کے باوجود ربانی ہدایت سے محروم تھے اور اس کے مقابلے ان انسانوں کو فائز المرام بتایا ہے جن کی زندگی کا ہر گوشہ مفلس اور فاقہ کش ہونے کے باوصف مشیتِ ربانی کے تابع تھا۔ دنیوی نقطۂ نگاہ کے مطابق شداد ہامان اور فرعون کامیاب تھے۔ لیکن خدا کی نظر میں بلال حبشیؓ کامیاب ہے۔ صہیب رومیؓ کامیاب ہے۔ جو رضائے الٰہی کو اپنا محور و مرکز بنا کر اسی کے حصول کے لیے زندگی کی بازی لگا دیتا ہے۔ اغراض کا بندہ

نہیں ہوسکتا۔ نفس کی اطاعت اور خدا کی اطاعت دو متضاد چیزیں ہیں ایک کے لیے دوسری کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ طاغوت سے رشتہ جوڑ کر انسان خدا کا بندہ نہیں ہوسکتا بہت بڑا فرق ہے۔ بشری فروگذاشتوں میں اور طاغوت کی بندگی میں خدا کے بندے سے جب کسی معصیت کا صدور ہوتا ہے تو وہ احساس کی آگ میں اس قدر پگھلتا ہے۔ اس قدر نادم اور شرمندہ ہوتا ہے کہ اس کی ندامت اسے بارگاہِ صمدیت سے قریب کر دیتی ہے۔ گناہوں کی گرد کو معصیت کے آنسو دھو ڈالتے ہیں گرد دھل جانے کے بعد ایمان کے چہرے پر جو نکھار آجاتا ہے۔ اس پر رحمتِ باری نثار ہونے لگتی ہے۔ طاغوت کے بندے کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوسکتی گناہ کی شقاوت کو اور بھیانک بنا دیتے ہیں۔ وہ گناہوں پہ اکڑتا ہے فخر کرتا ہے اور مزید گناہوں کا ارتکاب کرنے کے لیے نئی نئی راہیں ڈھونڈنے میں مصروف ہوجاتا ہے جس گناہ کے ارتکاب کے بعد دل میں خدا کا خوف پیدا ہوجائے۔ نیناں سے چھم چھم آنسو برسنے لگیں اور احساس کی آگ توبہ کے دروازے پہ لے آئے، وہ مبارک ہے، دروازہ پر پہنچنے کے بعد بالعموم دروازہ کھلنے کی امید ہو جاتی ہے، شکستگی کے اعتراف کے ساتھ آنے والوں کے لیے آخر کون دروازہ بند رکھتا ہے؟ غیظ و غضب کی آگ کو آنکھوں سے گرنے والا ندامت کا ایک آنسو

بھی ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ اس صحابیؓ پہ اللہ کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں جو رحمت کا ادا شناس تھا۔ جس کا معمول یہ تھا کہ خدا کی محبت میں جو آنسو گرتا وہ اسے ضائع نہ ہونے دیتا۔ چہرے اور بدن پر مل لیتا۔ ایک استفسار کے جواب میں خدا کے اس مقبول بندے، نے کہا کہ میں نے رحمتِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا کے خوف میں گرنے والا آنسو بدن کے جس حصے پر لگے گا اس پر جہنم کی آگ، انشا اللہ نہ ہو گی۔

یہیں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن آنکھوں کو خدا کی یاد میں رونے کی سعادت نصیب ہے۔ جو دل عشقِ الٰہی میں تڑپنے کے خوگر ہیں خدا کے نزدیک ان کی کیا قدر و منزلت ہے؟

جہاں پر خون ہو کر دل نگاہوں سے ٹپکتا ہے
وہیں محوِ عبادت بندگی محسوس ہوتی ہے۔

اعترافِ عبودیّت

انسان اپنی عقل و فکر کے تمام تر دعووں کے باوجود قدرت کے ان سربستہ رازوں کو معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ جن کے تعلق عالمِ غیب سے ہے۔ عالمِ غیب کی حقیقتوں کو معلوم کر لینا تو خیر بہت بعد کی بات ہے

ابھی تک یہ خاک و خون کا پتلا عالمِ شہود کے اسرار بھی معلوم نہیں کر سکا، برق و بخارات کی دنیا پہ قابو یاب ہونے کے بعد ابھی تک یہ لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہو کائنات کے ایک حقیر ذرے کی تھوڑی سی حقیقت معلوم کر سکا ہے اور اسے ایٹمی قوت کا نام دے کر خالقِ والرزاں ہے نہ جانے ابھی کتنی حقیقتیں اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور یہ عالمِ آخرت کا سفر طے کرنے تک ان کا سراغ لگانے میں کہاں تک کامیاب ہو سکے گا؟

انسان دنیا میں نائبِ حق ہے اور نیابت کے فرائض سرانجام دینے کے لیے جو بھی صلاحیتیں درکار ہو سکتی ہیں، ان کے عطا کرنے میں قدرت نے انتہائی فیاضی سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ یہ فنا پذیر قوتوں کا مالک قدرت کی لازوال اور باقی رہنے والی حکمتوں کا حریف و مقابل بھی بن سکتا ہے۔ گدا کو شاہ خواہ کتنی بھی نعمتوں سے نواز دے۔ وہ بہرحال گدا ہی رہے گا۔ اس کا یہ دعویٰ درست نہیں ہو سکتا کہ وہ شاہ کے خزانوں کی حقیقت و ماہیت سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے۔ اس کے تمام سربستہ رازوں کو اس نے پا لیا ہے اور اب ایسی کوئی حقیقت باقی نہیں رہی جسے اس نے پوری طرح جان نہ لیا ہو۔ اس قسم کے دعوے اوّل تو شانِ گدائی کے منافی ہوتے ہیں، گدا شاہ

کا قرب حاصل کرنے کے بعد اور اس کے مزاج میں دخل پا لینے کے باوصف بھی گدا ہی رہتا ہے۔ بخشش و نوازش سعادت مند گدا کو شکر کے مقام پر فائز کر دیتی ہے۔ اسے تو گدائی کے شکر ہی سے فرصت نہیں ملتی، وہ شاہ کا مثیل و مماثل بننے کے خیالات کو دل میں کہاں جگہ دے سکتا ہے؟۔ رذیل انسان کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ اس پر جب بخشش و رحمت کے دروازے کھلتے ہیں تو اس کی عقل میں فتور آنے لگتا ہے، وہ اپنی حقیقت بھول کر آقا سے ہمسری کا دعوےٰ کرنے لگتا ہے، فطرت اگر سعید ہو، ذہن و ضمیر اگر پاک ہوں تو قرب کا ہر مرحلہ اسے عرفانِ ذات سے شناسا کر دیتا ہے، اور یہی عرفان اسے مزید قرب کا حق دار بنا دیتا ہے، جو عطا انسان کو معرفت شناسی کے لیے تیار کرنے کی بجائے اپنی ہی ذات کے محاسن کے حسن و جمال میں الجھا دے، وہ حجاب ہوتی ہے اور بندے کو خدا کی بارگاہ سے بہت دور پھینک دیتی ہے، عطا وہی انعام و کرم کہلا سکتی ہے جو انسان کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھا دے اور اسے منعم کی مزید معرفت کا حق دار بنا دے۔

حضورؐ ہر آن معرفت ربانیہ کے ان گنت دریا عبور کرنے کے باوجود بھی ہمیشہ یہی فرماتے رہے ہیں کہ میں معرفت الٰہیہ کو اس طرح حاصل نہیں کر سکا، جیسے اس کا حق تھا۔ یہ اعتراف عبودیت حضورؐ کی تکمیل کی

دلیل ہے۔ لازوال قوتوں کی مالک و مختار ذات کی بارگاہ میں انہی لوگوں کو مقام و مرتبہ ملتا ہے، جو اعترافِ عبودیت کرتے ہیں۔ کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنی محدود دنیا کو جو لوگ عقل و دانش کی کل کائنات سمجھ کر ربانی قوانین پر حرف گیری کرنے لگتے ہیں، ان کا انجام ابلیس سے مختلف نہیں ہوتا، آخر ابلیس کا گمان بھی تو یہی تھا کہ آدم کے سجدے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔

جمال کی لذتیں

نعمت کی موجودگی میں بہت کم لوگوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، ورنہ بالعموم نعمت کے زوال کے بعد ہی اس کی قدر معلوم ہوتی ہے، مرض شدت اختیار کرلے تو صحت یاد آنے لگتی ہے، جوانی کی پُرکیف بہاریں گذر جائیں اور ان کی جگہ بڑھاپے کے سائے منڈلانے لگیں، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا مشکل ہو جائے، معدہ غذا ہضم کرنے سے انکار کر دے، تازہ خون پیدا نہ ہو۔ اور دل میں نشاط کے جذبات کی تخلیق کی بجائے غم و آلام کے جذبات پیدا ہونے لگیں تو جوانی کا ہر لمحہ یاد آنے لگتا ہے، جو کبھی سرور انگیز اور نشاط خیز ہوتا تھا، جس سے

زندگی عبارت تھی۔ قدرت کا قانون یہی ہے کہ گذرے لمحے واپس نہیں آتے۔ ان کی یاد باقی رہ جاتی ہے جو دل میں تیر و نشتر بن کر کھٹکتی رہتی ہے۔ کسی گمراہ مسافر کو اپنا سب کچھ ضائع کرنے کے بعد بھی اگر احساس زیاں ہو جائے اور وہ دوریٔ منزل کے احساس سے مضطرب ہونے لگے۔ تو بسا اوقات اس پر زندگی کی راہیں کشادہ ہو جاتی ہیں۔ کشادگی پیدا کرنے والی چیز احساس کی شدت اور دوریٔ منزل کا احساس ہوتا ہے جو مسافر حیات کی پونجی لٹا دینے کے بعد بھی دولت سے بہرہ ور ہو جائے۔ وہ محروم نہیں ہوتا منزلیں خود اس کے استقبال کے لیے آتی ہیں، راہیں اس کے لیے کشادہ ہوتی ہیں اور غیب سے اس کی رہنمائی کے سامان پیدا ہوتے ہیں۔ یہ عالم شہود ہی ایک عالم نہیں، بہت سے نادیدہ عالم ہمارے اندر اور باہر موجود ہے۔ جن کی کہنہ و حقیقت کو ابھی تک نہ ہی ہماری آنکھیں دیکھ سکی ہے اور نہ ہی ہماری عقل انہیں پا سکی۔ ایسے ان گنت جہان ہمارے حواس کی دسترس سے باہر ہیں۔ ظاہر کو ظاہر پا سکتا ہے اور باطن کو باطنی حواس کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ انسان ظاہری حواس ہی کا مجموعہ نہیں۔ اس کے اندر کئی نادیدہ جہان ہیں، کئی مستور اور چھپی ہوئی کیفیتیں اور جذبے ہیں، احساسات و برکات کے کئی ناپید اکنار سمندر ہیں، جو اس خاک و خون کے پتلے کی باطنی

دنیا میں چھپے ہوئے ہیں باطن کا آئینہ جب مجلّٰی اور روشن ہو جاتا ہے تو اس میں کئی چھپی ہوئی حقیقتوں کا عکس پڑنے لگتا ہے۔ پھر انسان کو وہ حقیقتیں واضح طور پہ دکھائی دینے لگتی ہیں جنہیں اس کی نگاہوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوتا، اور نہ ہی ان کا دھندلا سا تصور اس کے وہم و گمان میں آسکتا ہے

انبیاءؑ کے حواس کا سلسلہ ظاہری دنیا تک ہی محدود نہ تھا، انہیں ایسی قوتیں بھی عطا کی گئی تھیں، جو ظاہر حواس پر فوقیت رکھتی تھیں انبیاء دل کے کانوں سے سنتے تھے، باطنی نگاہوں سے دیکھتے تھے، اور کائنات میں ان کی جو قوت متصرف تھی، وہ ظاہری قوت نہ تھی، بلکہ وہ خالصاً باطنی قوت تھی۔ جو انہیں نائبِ حق کی حیثیت سے عطا کی گئی تھی۔ انبیاءؑ کا کسی محفل میں موجود ہونے کے باوصف وحی الہام کے ذریعے حق کی آواز کو سن لینا اور چھپے ہوئے رازوں کو معلوم کر لینا اسی باطنی قوت کا نتیجہ تھا، ورنہ ظاہر بات ہے کہ دوسرے لوگ بھی وہاں موجود ہوتے تھے، جو نہ رب تعالیٰ کے قاصد جبرائیلؑ کو دیکھ سکتے تھے، اور نہ ہی اس کی آواز کو سن سکتے تھے۔ یہ دیکھنا اور سننا باطنی حواس سے تھا۔ باطنی حواس کی قوت مومن کی میراث ہے۔ یہ اسے انبیاءؑ کی وساطت سے ملا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے۔ جب انسان انبیاءؑ کے

بنائے ہوئے طریقوں پہ گامزن ہو سرکش اور باغی انسان کسی حکومت کے راز معلوم نہیں کر سکتا، ایسے ہی دل کے آئینے کو معصیت کی گرد سے خراب کر لینے والے لوگ مشاہدۂ جمال کی لذت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے، روحانی لذتیں ایمانِ کامل کا نتیجہ ہوتی ہیں، اور یہ بارگاہِ جمال سے صرف ان ہی لوگوں کو ملتی ہیں جو گناہوں کی کثافتوں سے دور رہ کر جمال کی لطافت سے رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔

مختلف راستے اور مختلف منزلیں

خدا کی راہ میں پیش آنے والی ہزیمتوں اور شکستوں کو بھی مردانِ حق اس خیال سے عزیز جانتے ہیں کہ یہ اختیاری نہیں۔ اصل چیز حق کے غلبے کے لیے جدوجہد تھی اور یہ انہیں حاصل ہے۔ خدا کی راہ میں پیش آنے والی ناکامی کو وہ اس کامیابی سے بہتر سمجھتے ہیں جو نفس کی اتباع میں حاصل ہو۔

اصل چیز کامیابی یا ناکامی نہیں وہ کوشش ہے جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ کافر کی جدوجہد کا مقصود چونکہ ذاتی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے، اس لیے ناکامیوں سے دوچار ہونے

کے بعد اس کے جذبات پر اوس پڑ تی جاتی ہے اور وہ انتہائی رنجیدہ اور کبیدہ
خاطر نظر آنے لگتا ہے۔ مومن کی جدوجہد کا مقصود اتنا اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے
کہ نفسانی خواہشات کی گرد اس کی دل آویزیوں کے آئینے کو دھندلا نہیں سکتی
اس لیے وہاں رنج و ملال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مومن اپنا سب کچھ
نثار کرنے کے بعد بھی فرحاں و شاداں نظر آتا ہے اور کافر اس راہ میں
معمولی سی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس کی مثال دینے کے لیے ہمیں زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں،
اسلام کے اندر اس کی ان گنت مثالیں موجود ہیں کفر و اسلام کے پہلے معرکہ
ہی کو دیکھ لیجیے جو بدر کے نام سے موسوم ہے۔ نقصان یہاں کافروں کا بھی
ہوا اور مسلمانوں کا بھی، لیکن معرکہ بدر کی بعد کی تاریخ کو ہم دیکھتے ہیں تو
ہمیں مکہ میں صفِ ماتم بچھی ہوئی نظر آتی ہے اور ان لوگوں کی ماؤں بہنوں
اور بیٹیوں کی چیخوں کا شور سنائی دیتا ہے جو بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں
مارے گئے تھے۔ لیکن اس کے برعکس مدینہ کا حال یکسر مختلف نظر آتا ہے،
یہاں شہداء کے ورثا مطمئن نظر آتے ہیں۔ ماتم اور شور و شین تو ایک طرف
رہا کسی کے چہرے پر ملال کے آثار نظر نہیں آتے۔ بلکہ اس احساس سے
چہرے شگفتہ ہیں کہ ان کے شہدا کا خون اسلام کے کام آیا۔ معرکہ بدر کے
بعد کی مکی تاریخ آپ کو نوحوں، مرثیوں، دلدوز چیخوں اور آہوں کراہوں کی

تاریخ نظر آئے گی، لیکن تلاش و کوشش کے بعد بھی مدینہ کی کوئی ایسی خاتون نہ مل سکے گی جس نے اپنے کسی شہید کا مرثیہ لکھا ہو اور اس میں اس احساس کا اظہار کیا گیا ہو، کہ اسے بدر میں موت کیوں آئی؟ مسلمان خواتین اپنے شہدا کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتی ہیں اور کافر عورتیں اپنے مقتولین کے غم میں گھل گھل کر زندگی برباد کر رہی تھیں۔

کامیابی اور ناکامی کا جو تصور اسلام نے دیا ہے وہ مادی دنیا کے تصور سے یکسر مختلف ہے یہاں کامیابیوں اور ناکامیوں کا اندازہ مومن کے عزم و ارادے سے لگایا جاتا ہے۔ اگر اس کا عزم بلند ہے۔ جذبات کے سمندر کی سطح پر موج در موج طوفان اٹھ رہے ہیں تو وہ ہر حال میں کامیاب ہے۔ کامیابی کی دلیل ان عزائم کو سمجھا جائے گا جنہوں نے اسے مہیب طوفانوں کی ہولناکیوں سے بے نیاز کر دیا ہو کافر کو یہ سعادت نصیب نہیں ہو سکتی وہ خطرات میں کودنے سے پہلے سو بار حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے جب ہر طرح سے اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اسے کوئی خطرہ نہیں تو جد و جہد کا آغاز کرتا ہے۔

کافر اور مومن کی زندگی میں یہ بنیادی فرق اس لیے ہے کہ کافر کی زندگی کا مقصود دنیوی لذات کے سوا کچھ نہیں۔ اور مومن کے نزدیک اصل راحتیں وہ ہیں جو اسے آخروی زندگی میں نصیب ہوں گی۔ جہاد

حق، اخروی زندگی کی راحتوں کے حصول کا اولین ذریعہ ہے۔ اور اس کے بغیر مومن کی زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ تمام راحتیں میسر ہونے کے باوجود بھی اگر کوئی اسلام کی سربلندی کے لیے کوشش نہیں کرتا تو وہ ناکام ہے۔ اور اگر مفلسی میں بھی اس کی تگ و دو کا سلسلہ جاری ہے تو وہ کامیاب ہے۔

خالد کی سرگذشت

دل احساس کی دولت سے محروم نہ ہو، تو دل کو زندگی ملتی ہے۔ اور اس منزل کا سراغ بھی جو حیات کی منزل ہے۔ ہدایت احساس کی بیداری کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ احساس کے نشتر غافل کو بیدار اور گمراہ کو منزل رسید بنا کے چھوڑتے ہیں۔ معصیت سے آلودہ انسان جس کا احساس زندہ ہو ایک نہ ایک دن ہدایت پا کر رہتا ہے۔ گناہ کی زندگی میں اس کا قلب مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اور یہی ندامت اسے ہدایت کی طرف لے آتی ہے۔

اسلام کے ایک عظیم فرزند خالدؓ بن ولید نے اسلام لانے کے بعد اپنے جن جذبات و تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گمراہی کی زندگی میں ان کا قلب مطمئن نہ تھا۔ خود

فرماتے ہیں کہ اسلام کے حریف کی حیثیت سے ہیں جس معرکے ہیں بھی شریک ہوا ہوں، ہیں نے کفر کے پرچم کے نیچے کھڑے ہو کر جس شجاعت و بہادری کا بھی مظاہرہ کیا ہے اس سے میری روح کو شدید اذیت ہوئی ہے خلوتوں ہیں جب بھی بیٹھا ہوں، دل کی دنیا ہیں جب بھی جھانک کر دیکھا ہے خود کو اضطراب کے طوفانوں ہیں گھرا ہوا پایا ہے۔ دل نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ تو نے خداداد صلاحیتوں کو غلط استعمال کیا ہے۔ ہر صلاحیت خدا تعالیٰ کے دین کی نصرت و حمایت کیلئے صرف ہونی چاہیے تھی۔ آخر احساس کی یہی بیداری میری رہنما بن گئی۔ اور مجھے ظلمت کے طوفانوں سے کھینچ کر اس نور کی آغوش ہیں لے آئی جو سرمدی ہے جس کا ہر جلوہ نظر فروز اور جلا نواز ہے۔ یوں تو یہ احساس ہمیشہ سے موجود تھا لیکن مکہ ہیں عمرہ کی غرض سے حضورؐ کا ورود میرے لیے اِک نئی صبح کا پیغام ثابت ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ مکہ ہیں حضورؐ کی قیادت ہیں مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر قریش کے وہ بہادر مکہ چھوڑ گئے تھے۔ جن کے دل ہیں اسلام کا شدید بغض تھا۔ قریش اور مسلمانوں ہیں صلح کی شرائط طے ہو جانے کے بعد مسلمان مکہ ہیں آنے کے مجاز تھے، اور آئینی لحاظ سے انہیں روکا نہیں جا سکتا تھا۔ میرا تعلق بھی قریش کے ان نوجوانوں سے تھا جو مسلمانوں کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ عمرہ

کے ایام میں میں بھی مکہ چھوڑ گیا۔ میرا بھائی ولید جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا، وہ بھی عمرہ کی غرض سے مسلمانوں کے ساتھ آیا اور اس نے میری تلاش کی، حضورؐ علیہ السلام نے اس سے میرے متعلق استفسار کیا تو اس نے کہا کہ خالد بھی مکہ چھوڑ گیا ہے، وہ مسلمانوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ یہ سن کر حضورؐ کو قلق ہوا اور حضورؐ نے فرمایا کہ خالد جیسے ذہین انسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ زیادہ دیر تک اسلام سے دور رہے گا۔ حضورؐ نے غایتِ شفقت کی بنا پر یہ بھی فرمایا کہ خالد اگر میرے پاس آجاتا تو میں اس کے شایانِ شان سلوک کرتا۔

میرے بھائی ولید نے حضورؐ کے یہ تاثرات سن کر میرے نام ایک خط لکھا جس کا ایک ایک لفظ احساس میں ڈوبا ہوا تھا۔ خط کیا تھا، میری حیات کا ضامن، میری مسرتوں کا کفیل، جس نے میرے احساسات کا تار تار ہلا دیا۔ ظلمتوں سے نکال کر مجھے نور کی اس دنیا میں لے آیا جس کے جلووں کے لیے میری روح ازل سے بے تاب تھی۔ ولید نے لکھا تھا کہ حضورؐ تمہارے منتظر ہیں۔ عقل کرو، کس راہ پر گامزن ہو۔ یہ سلامتی کی راہ وہ ہے جس پر رسولِ خدا علیہ السلام کے قدموں کے نقوش ملتے ہیں۔ بہت سی سعادتوں کو تم کھو چکے ہو۔ اب بھی وقت ہے حضورؐ کے قدموں میں آکر تم کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہو۔ مقام تمہیں حضورؐ

کی غلامی بخشے گی کفر نے کیا دیا ہے؟ کفر کیا دے گا؟ کفر کیا دے سکتا ہے؟ حصول کی تمنا ہے تو آجاؤ، دروازے کھلے ہیں، راہیں کشادہ ہیں اور آغوشِ رحمت تمہاری منتظر ہے، جانتے ہو، تمہارا کس بے تابی سے انتظار ہو رہا ہے۔ تمہیں کون یاد کر رہا ہے؟ وہ! جس کی قدسیوں کے دل میں آرزو ہے، جس کا خدا مشتاق ہے۔ بس آجاؤ، دیر نہ کرنا"

ولید کے یہی الفاظ تھے جنہیں خالدؓ کی حیات کے دھارے کا منہ موڑ کر رکھ دیا۔ اشتیاق کی دنیا بے تاب ہو گئی۔ شوق نے نئی کروٹ لی۔ عشق کو زندگی مل گئی۔ احساسات کے سمندر کی ہر لہر مچل کر وجدان کے ساحل سے ٹکرانے لگی۔ آنکھوں نے آنسوؤں کے جو خزانے چھپا رکھے تھے وہ سب بہہ نکلے۔ کفر کی راہ پہ گامزن ہونے والا جرنیل اب اسلام کی راہ پہ گامزن تھا۔ شوق نے قرب و بعد کے تمام مرحلے طے کر لیے۔ وہ مکہ میں بیٹھ کر خود کو آغوشِ رحمت میں محسوس کر رہا تھا، رحمت اسے لوریاں دے رہی تھی۔ دستِ شفقت آستین سے نکل کر اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اور آنسوؤں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ اس کے ماضی کے تمام گناہوں کو دھو کر اس کے دل کی دنیا کو منور کر رہا تھا۔ آخر خالدؓ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا وہ مدینہ میں عثمان بن طلحہ اور عمرو بن العاصؓ کے ساتھ آیا تو تسکین بھی ملی۔ روح کو سرشاری بھی نصیب ہوئی۔ ماضی

کے گناہ بھی دُھل گئے اور رحمتِ کامل نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

محدّث اور حدیث

ابوزرعہ محدّث کا انتقال ہوا تو وہ اپنے آبائی وطن رَے کی ایک نواحی بستی میں مقیم تھے۔ حدیث سے انہیں جو غیر معمولی شغف تھا اسی کے باعث وہ علمائے عصر کے محبوب بن چکے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ابوزرعہ کو چھ لاکھ حدیثیں یاد ہیں جواہرات کے متعلق جوہری ہی کی رائے معتبر ہو سکتی ہے۔ گھسیارے کی رائے قبول نہیں کی جا سکتی۔ ایسا نہ کیا جائے تو دنیا کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ بھینس یا گھوڑے کے لیے گھاس خریدتے وقت ہو سکتا ہے کہ ہم ایک گھسیارے کی رائے دریافت کر لیں۔ لیکن جب ہم جوہری یا ڈاکٹر سے ہم کلام ہوں گے تو گھسیارے کے مشورے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی۔

عِلم حدیث کی خدمت میں جن لوگوں نے اپنی زندگی صرف کی ہے حدیث کے باب میں انہی کی رائے معتبر ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی منشی یا کلرک مشورہ دینے کی کوشش کرے تو اس کی حیثیت اس گھسیارے سے مختلف نہ ہو گی۔ جو گھاس بیچتے بیچتے لعل و یاقوت کی باتیں کرنے لگا ہو

انتقال کے وقت ابوزرعہ کے پاس علمائے محدثین کی جو جماعت تھی، اس کا تقویٰ مثالی حیثیت رکھتا تھا۔

حدیث کی روایت کرنے کے لیے تو دوسری اعلیٰ انسانی صفات سے متصف ہونے کے علاوہ اعلیٰ تقویٰ کی ضرورت بھی ہے۔ لیکن منکرِ حدیث بننے کے لیے کسی خوبی کی ضرورت نہیں، نہ زہد و تقویٰ کی، نہ اعلیٰ انسانی اقدار کی۔ جس شخص کو زندگی بھر حلال لقمہ نصیب نہ ہوا ہو، حرام کا مال خون بن کر رگوں میں دوڑ رہا ہو، اور زندگی بھر نیئے نیئے خداؤں کے آستانے کی خاک بوسی اس کا شعار بن چکا ہو۔ وہ بڑی بے تکلفی سے ان لوگوں کی بے لوث دینی خدمت کو عجمی سازش قرار دے سکتا ہے جن کی پاکبازی مسلمات کا درجہ رکھتی ہے جن کی جبیں ساری رات اپنے رب کے حضور جھکی رہتی تھی۔

جن نفوسِ قدسیہ کو خدا تعالیٰ نے احادیث نبویہ کی ترتیب و تدوین اور نشر و اشاعت کی توفیق بخشی تھی۔ حدیث کی برکت سے انہیں وہ محبوبیت عطا ہوئی ہے کہ ہر دور میں ان کا تقویٰ اور ورع ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک رہا ہے۔ سوادِ اعظم نے ان کی غایت درجہ تعظیم کی ہے۔ چند لوگوں کے انکار سے ان کا زہد و تقویٰ محل،

نظر نہیں بن سکتا۔ آفتاب کور چشموں کی تائید کے بغیر بھی آفتاب
ہی رہتا ہے۔ اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ابوزرعہ نزع
میں تھے، تو بعض علماء نے انہیں کلمہ پڑھنے کی ترغیب دینا
چاہی، لیکن انہیں یہ حجاب مانع تھا کہ اتنے عظیم محدث اور
پاکباز انسان کو کیسے ترغیب دیں۔ طے یہ پایا کہ جس حدیث میں
آخری وقت کلمہ طیبہ پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اسے پڑھنا شروع
کیا جائے ترغیب کی یہ اچھی صورت تھی۔ چنانچہ حدیث کی روایت
معہ اسناد پڑھنا شروع کی گئی ایک راوی پہ پہنچ کر پڑھنے والا
رکا تو ایک اور محدث نے روایت شروع کر دی۔ اتفاق سے
وہ بھی ایک راوی پر پہنچ کر رک گیا اور ابوزرعہ نے روایت
شروع کر دی محدثین کہتے ہیں کہ از اول تا آخر وہ کہیں نہیں
رُکے۔ حالانکہ ان پہ نزع کا عالم طاری تھا۔ حدیث سے
یہ شغف ان کے کامل ایمان کا نتیجہ تھا۔

آداب اور معاشرت

سلسلۂ چشتیہ کے مقتدا حضرت مودود چشتی کو جب دعوت وارشاد کا منصب سونپا گیا تو ان کی عمر بہت کم تھی۔ یہ منصب ان کے والد ماجد حضرت امام ناصر الدین ابو یوسف چشتیؒ نے تفویض کیا تھا۔

حضرت مودود چشتی عنفوانِ شباب ہی میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد علوم دینیہ کے متبحر عالم بن چکے تھے۔ عبادت و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ قائم اللیل وصائم الدھر تھے۔ منہاج العارفین حضرت کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جو بزرگانِ سلف کے حالات پر مشتمل ہے یہ کتاب حضرت نے پندرہ سال کی عمر میں تصنیف کی تھی۔

زندگی کا تمام تر محور و مرکز چونکہ رضائے الٰہی بن چکا تھا۔ اس لیے حضرت اتباعِ شریعت کا غایت درجہ خیال رکھتے تھے۔ سلطانِ سنجر ملک بن شاہ اگرچہ آپ سے غایت درجہ عقیدت رکھتا تھا لیکن کسی انسان نے آپ کو اس کی تعظیم و تکریم کے لیے کھڑے ہوتے نہیں دیکھا۔ آپ کی تمام شفقت و محبت غربا و مساکین کے لیے تھی اور ان کی انتہائی تعظیم کرتے تھے۔ حضرت کا معمول تھا کہ ہمیشہ سلام کہنے میں تقدیم کرتے۔ بعض عقیدت

مندوں نے ایک دفعہ عرض کیا کہ آپ انتہائی معمولی آدمیوں کو پہلے سلام کہتے ہیں حالانکہ آپ کو سلام عرض کرنا ان کا حق ہے۔ چھوٹوں کو بڑوں کی تعظیم کرنی چاہیئے۔

حضرت نے جو ارشاد فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ محبت و شفقت جب حدِ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو دنیا کے بنائے ہوئے ایسے آئین و قوانین سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ اسے رحمتیں بھیجنے اور محبت و شفقت کا اظہار کرنے میں مزا آتا ہے اس سلسلے میں حضرت نے ان لوگوں کی توجہ واقعہ معراج کی طرف مبذول کرائی اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کی رات حریم جمال میں پہنچے تو پہلے خدا تعالیٰ نے حضورؐ کو سلام کہا تھا۔ اسلام علیک ایھا النبی اس کی دلیل ہے یہ ناقص انسان کے بنائے ہوئے ضابطے ہیں کہ چھوٹا بڑے کو سلام کہے۔ چھوٹوں سے ایسی توقع رکھنے سے انسان میں کبر پیدا ہوتا ہے اور کبر انسانیت کے زوال کا باعث بنتا ہے۔ چھوٹوں سے اس طرز کی توقع رکھنے کے بعد جب انسان کی یہ عادت راسخ ہو جاتی ہے کہ میں بڑا ہوں چھوٹوں کو مجھے سلام کہنے میں پہل کرنی چاہیئے تو پھر وہ بڑوں سے بھی یہی توقع کرنے لگتا ہے۔ صغیرہ گناہ پہ اصرار انسان کو کبائر کو خوگر بنا دیتا ہے۔ صغائر سے بچنے کی عادت ڈال لی جائے تو خداوند کریم انسان کو کبائر سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

یہی عاجزی اور فروتنی جو حضرت کا شعار تھی، ان کے عقیدت مندوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ بھی اپنے شیخ کی پیروی کرنے لگے۔ اسی فیض صحبت کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ کے خلیفہ حضرت شریف زندنی عجز و انکسار کا پیکر بن گئے غایت درجے کی عظمتوں کے حصول کے بعد بھی ان کا یہ معمول تھا کہ جب بھی کوئی افلاس زدہ اور پھٹے کپڑوں میں ملبوس فقیر آپ کے پاس آجاتا تو اس کے سامنے غایت درجہ عجز و انکسار کا اظہار کرتے، آبدیدہ ہو کر دعا فرماتے کہ الٰہی اس غریب اور مسکین کو صراطِ مستقیم پر استقامت عطا فرما ہر مسکین کو پہلے سلام کہنا شریف زندنی کا معمول تھا اور یہ طریقہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت مودود چشتی رح سے اخذ کیا تھا۔

انسان کے پیشِ نظر جب حضور خیر الانامؐ کا اسوۂ حسنہ ہو تو اس کے بھٹکنے اور گمراہ ہونے کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ گمراہیاں اور ظلمتیں وہیں پر پھیلاتی ہیں، جہاں آفتاب کا نور نہ ہو۔ آفتاب کے نور میں چلنے والے مسافر ٹھوکروں سے محفوظ رہتے ہیں، انہیں گڑھوں میں گر کر ہلاک ہونے کا خطرہ نہیں رہتا۔

اہل مدینہ کو حضور علیہ السلام نے ابتداہی میں جو تعلیم دی تھی، اس میں معاشرت کے اصول بھی تھے۔ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ ایک دوسرے کو سلام کہا کرو، کھانا کھلاؤ اور رات کے اس حصے میں عبادت کرو جب

لوگ سو جائیں، اہل مدینہ کو سلام کہنے کی تعلیم دیتے وقت حضورؐ نے چھوٹے بڑے کی تمیز مٹادی تھی۔ یہ نہیں فرمایا تھا کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کہیں اور وہ ان کے سلام کا جواب دیں۔ اس نوع کے جو قواعد و ضوابط بھی مرتب کئے گئے ہیں وہ شیطانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ رحمانی تعلیمات کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔ صحابہؓ کبار ایک دوسرے کو سلام کہتے وقت مقام و منصب کا خیال نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مسلمان بھی سامنے آئے اسے پہلے سلام کہیں۔

انسان جب کبر کا پتلا بن جاتا ہے، عُجب اس کے رگ و ریشہ میں سما جاتا ہے تو وہ دوسروں کی تعظیم کرنے کی سعادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ انسانی عظمت دوسروں سے تعظیم کرانے میں نہیں تعظیم کرنے میں ہے۔

گمراہی اور ہدایت

نماز میں ہم خدا تعالیٰ سے ان لوگوں کے راستے پر چلنے کی توفیق طلب کرتے ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے گمراہیوں سے محفوظ رکھا ہے اور ان لوگوں کی اطاعت سے پناہ مانگتے ہیں جن پر

خدا تعالیٰ کا غضب ہے۔

ربّانی ارشاد کے مطابق سیدھی راہ وہی ہے جس پر نبیؐ صدیق شہید اور صالح لوگوں کے قدموں کے نشانات ملتے ہیں جس راہ پر خدا تعالیٰ کے کسی مقبول بندے کے قدموں کا نشان موجود نہ ہو، وہ سیدھی راہ نہیں ہو سکتی عقلِ انسانی کوئی ایسا راستہ تلاش بھی کرلے جو منزل کی طرف رہنمائی کر سکتا ہو۔ لیکن اس پر کوئی ایسا نقشِ قدم فروزاں نہ ہو جسے ہم خدا تعالیٰ کے کسی نیک بندے کا نقشِ قدم کہہ سکیں تو وہ راہ خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں۔ مقبول وہی راستہ ہے جس پر ان انعام یافتہ لوگوں کا قافلہ گزرا ہے اور اس پر ان کے قدموں کے نشانات ملتے ہیں۔

فکرِ انسانی کے قدم قدم پر بھٹکنے اور گمراہ ہونے کے امکانات موجود ہیں اس لیے حیات کی بھول بھلیوں میں خدا تعالیٰ نے انسان کو رہبری کے بغیر نہیں چھوڑا۔ رات کے مسافر کے لیے ستاروں کی قندیلیں جو کام دیتی ہیں صالحین کے نقوشِ قدم وہی کام دیتے ہیں۔

جو مسافر ستاروں کی قندیلوں کو نظر انداز کر کے سفر کرنا چاہے اور ان کے نور سے استفادے کو توہین خیال کرے اس کا قدم ٹھوکر سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور جو فکر کو راہنما بناتا ہے صالحین کی راہ

پر نہیں چلتا، وہ خطرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

ظلمتیں ٹھوکر کے سوا کچھ نہیں بخش سکتیں۔ راہنمائی نور کا حصہ ہے سلامتی کے ساتھ منزل رسیدہ ہونے کے لیے نور کی راہنمائی میں آنا پڑتا ہے۔ ہر راہ پر چلنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہوتا ہے کہ یہ شیطان کی راہ تو نہیں؟ مقبولانِ بارگاہ کی راہ ہے؟

یہ معلوم کر لینے کے بعد انسان مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔ یوں تو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کو ہدایت کی ضرورت ہے، توفیقِ ربانی کے بغیر ایک قدم بھی سلامتی کی منزل کی طرف قدم نہیں اٹھ سکتا۔ لیکن انسان جب ہادی اور راہبر کا منصب اختیار کرنے کے بعد ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو اس کے لیے اپنے اعمال کا جائزہ لینا ازبس ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ میں ہدایت کی راہ پر ہوں؟ تبلیغ کا پہلا مستحق انسان کا اپنا نفس ہے۔ نفس کا گھوڑا اگر بے لگام ہو اور خواہشات کے دلدل میں پھنس جائے تو ایسا انسان خود ہدایت کا محتاج ہوتا ہے دوسروں کی راہبری کا فریضہ سر انجام نہیں دے سکتا۔

خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں نے دوسروں کی ہدایت کی نسبت اپنے نفس کو وعظ کہنے کی زیادہ ضرورت محسوس کی ہے۔ کیونکہ یہ راہ بڑی

کٹھن ہے۔ تزکیہ نفس کے بغیر انسان جب ہادی بن کر نمودار ہوتا تو اس کے
نفس کی شرارتیں اقوام و ملل کی شیرازہ بندی کا کام نہیں کر سکتیں وہ متحد اور
منظم لوگوں میں بھی اضطراب و انتشار پھیلانے کا موجب ثابت ہوتا ہے۔
ہدایت اس کے نزدیک وہی ہوتی ہے جس سے اس کے نفس کو غذا مل سکتی
ہو۔ اور اس کی کبریائی کا لوہا تسلیم کیا جا سکے۔ یہ راہ اپنی برتری تسلیم کرانے
کی راہ نہیں عجز و انکسار کی راہ ہے۔ انبیاءؑ کی سیرت ہمارے سامنے
ہے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاءؑ نے تشدد کے ذریعے اپنی بات منوانے
کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ تشدد برداشت کیا ہے۔ انتہائی نامساعد حالات
میں بھی ان کی زبان آلودگیوں سے پاک رہی ہے۔ لوط علیہ السلام کو قوم نے
سفیہ کہا تو وہ برانگیختہ نہیں ہوئے نہایت متانت سے جواب دیا۔ کہ اے
قوم! میں سفیہ نہیں، بلکہ تمہارے رب کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

نوح علیہ السلام پر بھی یہی واردات گذری ہے قوم نے انہیں گمراہ
کہا اور انہوں نے جذبات کی متانت میں جواب دیا کہ میں گمراہ نہیں، بلکہ
رب العالمین کا رسول ہوں۔ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ بھی ہمارے سامنے ہے
جو شخص اپنی بات منوانے کے لیے سبّ و شتم سے کام لیتا ہے، وہ ہادی
نہیں مفسد ہے۔ ہدایت کے پردے میں اپنی فطری کمینگی کا اظہار کر رہا
ہے۔ ہدایت پھیلانے کے لیے ان ہادیوں کے طریق کار پر عمل پیرا ہونا

ضروری ہے، جنہیں خدا ہادی کہتا ہے اور ان کی اطاعت کو لازمی ضروری قرار دیتا ہے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کسی شخص کے لب و لہجے سے نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ اصلاح کا طالب ہے یا خطابت کے جوہر دکھا کر فتنہ و فساد کا موجب ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے پیش نظر ہدایت نہیں کچھ اور مقاصد ہیں جو اسے فتنہ انگیزی کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔

شفقت اور رحمت

ہر نعمت تقسیم کرنے سے بڑھتی ہے اور بخل سے زوال پذیر ہوتی ہے۔ نعمت کا یہی شکر ہے کہ اسے تقسیم کیا جائے۔ اس میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا جائے جو محتاج اور غریب ہوں اور جن کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو ایسے لوگوں کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ وہ دعا کریں۔ وہ مجسم دعا بن جاتے ہیں زبان سے کچھ نہ بھی کہیں لیکن انکا حال دعا بن جاتا ہے۔ گدا کی صورت سوال بن جاتی ہے تو وہ بھی محروم نہیں رہتا۔ اور جب غریب کا حال دعا بن جائے تو رحمتوں کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ جو دروازے برسوں کی عبادت سے نہیں کھل سکتے، انہیں غریب کی آنکھوں سے گرنے والے تشکر کے آنسوؤں کے چند قطرے کھول دیتے ہیں۔ رحمت الٰہی دور نہیں،

اس کا ٹھکانا ٹوٹے ہوئے دلوں میں ہے۔ اس روزن سے جھانک کر دیکھا جائے تو شاہدِ مطلق کے جلوے نظر آنے لگتے ہیں رحمتِ الٰہی ہم آغوشی کے لیے بے تاب ملے گی۔ قصر و ایوان تو فانی حسن کا مسکن ہوتے ہیں باقی رہنے والی رحمت ان میں کہاں مل سکتی ہے؟ اس کا سراغ تو انہی دلوں سے مل سکتا ہے جو زمانے کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں اور ان پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ باحیا اور باعصمت حسن اپنی جلوہ گری کے لیے ہمیشہ انہی خلوتوں کو منتخب کرتا ہے جو ہوس آلود نگاہوں سے مامون ہوں سر بازار جلوہ گری تو حسن کی توہین سمجھی جاتی ہے۔ جو چیز جتنی قیمتی اور لطیف ہو اسے اسی قدر حجاب میں رہنا پڑتا ہے۔ خوشبو لطیف ہے اسی لیے نظر نہیں آتی۔ حسنِ مطلق نے بھی اپنے لیے بے حجابی کو پسند نہیں کیا۔ دل کی خلوت کو اپنا مسکن بنایا ہے اور دل بھی نظروں سے پوشیدہ ہے اسامنے ہوتا تو شاید یہ بھی تجلّی گاہ نہ بن سکتا۔

آوارگیٔ شوق نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ ذکر ہو رہا تھا نعمت کی تقسیم کا کہ اہلِ حاجات پر تقسیم کرنے سے بڑھتی ہے۔ بعض عارفین جو خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے خاص مورد بنے ہیں، ان کے تذکروں میں مذکور ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کی عاجز اور درماندہ مخلوق پر رحم و کرم کے باعث ہی نوازے گئے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد حضرت شاہ

عبدالرحیم اپنے ایک رسالہ انفاس رحیمیہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت شبلی کو جو مقبولیت
اور محبوبیت ملی تھی وہ بلی کے بچے پر رحم و کرم کا نتیجہ تھا عبادت گذاری
میں شبلی کی عمر گزر گئی لیکن انہیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو انہیں شبلی بنا
سکتا۔ ایک رات تہجد کے لیے اٹھے تو انہیں اپنی قمیص کی آستین میں کسی
چیز کا احساس ہوا۔ ٹٹول کر دیکھا تو بلی کا بچہ تھا جو سردی سے پناہ حاصل
کرنے کے لیے ان کی آستین میں آ دبکا تھا۔ آستین میں گرم ہونے کے
باعث اسے نیند آ گئی۔ شبلیؒ تہجد کے لیے اٹھنے لگے تو انہیں خیال گزرا کہ میرے
حرکت کرنے سے اسے تکلیف ہو گی اس کی نیند خراب ہو جائے گی۔ اس
خیال کے آتے ہی وہ رک گئے۔ دل میں کہنے لگے کہ آج کی عبادت خدا
تعالیٰ کی اس ضعیف مخلوق کے آرام پر قربان کرتا ہوں۔ اس خیال کے
آتے ہی انہیں مقبول بنا لیا گیا۔ جو کام برسوں کی سجدہ ریزیوں سے نہ
ہوا تھا ایک ضعیف مخلوق پر رحم کرنے سے ہو گیا۔ قرب و بُعد کے مراحل
کے متعلق نہ جانے دنیا نے کیا کیا افسانے تراش رکھے ہیں۔ حالانکہ بات اتنی
سی ہے کہ جس کا قرب مطلوب ہو اس کی صفات اختیار کرنی چاہیئں۔ شرابی
کبھی متقی کا دوست نہیں بن سکتا۔ دونوں میں سے ایک کو اپنی صفات
ترک کرنی پڑیں گی، اسی صورت میں دوستی قائم ہو سکتی ہے۔ بندہ بھی
جب خدا تعالیٰ کی صفات اختیار کر لیتا ہے تو اسے ادھر سے صدا آئی

آنے لگتی ہیں۔ مخلوق پہ رحم و کرم خدا تعالیٰ کی عادت ہے۔ بندہ بھی اپنے اندر یہ خوبی پیدا کر لیتا ہے تو مستحق کرم قرار پاتا ہے۔ ظالم اور بے درد انسان کو کسی حال میں بھی یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ اس کے ہاتھ اور زبان سے ہمیشہ خدا کی مخلوق کو نقصان پہنچتا ہے۔

اَبدی زندگی

بعض عارفین کا قول ہے کہ انسان کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ خلوت میں یا رحمٰن اس کے ساتھ ہوتا ہے، یا شیطان، جو واردات اسے پیش آئیں، ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا رفیقِ تنہائی کون ہے۔؟ رحمٰن کی معیت نصیب ہو گی تو رحمانی کیفیات وارد ہوں گی۔ شیطان ہم نشیں ہو گا تو دل و دماغ میں شیطانی خیالات پیدا ہوں گے۔ صحبت کسی کی بھی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہ رہے گی۔ وجدان بھی متاثر ہو گا اور شعور بھی احساسات تک اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

عبداللہ بن مبارکؒ سے ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ تنہائی میں آپ کا دل نہیں گھبراتا؟ آپ زیادہ وقت تنہائی میں گزارتے ہیں؟ فرمانے لگے کہ تنہائی میں، میں قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتا ہوں۔ مجھے خدا تعالیٰ

اور اس کے حبیب پاک علیہ السلام کی صحبت نصیب ہوتی ہے۔ مجھے تنہا کیسے کہا جا سکتا ہے؟

زبان پر کسی کا ذکر بھی ہو اور دل میں اس کی یاد بھی موجزن ہو تو وہ قریب ہوتا ہے۔ اسے دور نہیں کہا جا سکتا۔ دور تو وہ ہوتے ہیں جن کا نہ ہی کبھی زبان پہ ذکر آئے اور نہ ہی ان کی یاد دل کو کیف و سرور بخشے۔ دل میں بسنے والا ذکر بن کر زبان پر آنے والا، احساسات کی دنیا میں تلاطم پیدا کر دینے والا کبھی دور نہیں ہوتا خواہ وہ کہیں بھی ہو سات پردوں میں چھپ کر بھی وہ بے حجاب ہوتا ہے، اسے دل کی آنکھیں دیکھتی ہیں، دل کے کان اس کی باتیں سنتے ہیں۔ اور دل اس کے جمال سے لذت یاب ہوتا ہے۔

روح کی لذتیں جسمانی لذات پہ موقوف نہیں یہ احساسات کا کھیل ہے۔ احساس زندہ ہو تو وہ محسوسات کی دنیا کی خبر رکھتا ہے، جن حقیقتوں کو ظاہری حواس نہیں پا سکتے وہ روح کے احساسات و مدرکات کی دسترس سے باہر نہیں ہوتیں۔ جسم کو مادی غذا سے تقویت ملتی ہے اور ظاہری حواس کی صحت بھی جسمانی توانائی کا نتیجہ کہلاتی ہے۔ قوی میں اضمحلال آجائے تو اس سے حواس بھی متاثر ہوتے ہیں۔ روحانی احساسات کی صحت روح کی صحت پر موقوف ہے۔ روح

توانا اور صحت مند ہو تو روحانی احساسات میں بھی بلا کی قوت ہوتی ہے۔ وہ متاثر ہونے بھی ہیں اور متاثر کرتے بھی ہیں۔

بیمار جسم نہ غذا سے متاثر ہو سکتا ہے اور نہ دوسروں ہی پر کوئی خوشگوار اثر ڈال سکتا ہے۔ روح کی غذا جسم کی غذا سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ روح کو اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے یادِ الٰہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یادِ الٰہی جب اس کا وظیفۂ حیات بن جاتی ہے۔ تو اسے مفلوج کر دینے والی بیماریوں کے حملے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ صالح خون جسم کی توانائی کا ضامن ہوتا ہے اور روح کو زندگی عطا کرنے والی یادِ دوست اسے مرنے نہیں دیتی۔ ذاکر روح یہاں بھی زندہ رہتی ہے اور وہاں بھی یہاں بھی یادِ دوست اس کی غذا ہوتی ہے اور وہاں بھی اسے یہ غذا ملے گی۔ یاد زندگی ہے اور غفلت موت، غافل انسان زندہ رہ کر بھی مردہ ہوتا ہے اور ذاکر مر کر بھی حیاتِ جاوید کا مالک بن جاتا ہے ایک حیؔ و قیوم ذات سے تعلقات کی استواری اسے مرنے نہیں دیتی۔ اللہ کی راہ میں جاں نثار کرنے والوں کو زندہ کہا گیا ہے۔ کیونکہ یاد ہی ان کا سرمایہ حیات تھی۔ اور یاد ہی سے وہ زندگی پاتے رہتے ہیں۔

اخلاقی اقتدار

سعد ابن ابی وقاصؓ کی زیرِ قیادت غازیانِ اسلام جب ایران میں فتح و نصرت کے پرچم لہرا رہے تھے تو ایک محاذ پر انہیں عجیب و غریب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ جندی سالور کا محاذ تھا جہاں کے لوگ قلعہ بند ہو کر صحابہؓ کی کوششوں کو ناکام بنانے کی جد و جہد میں مصروف تھے۔ اندھیرے میں وہ اچانک نکل کر اسلامی لشکر پر حملہ آور ہوتے اور جان بچا کر قلعہ میں داخل ہو جاتے۔

ایک دن اچانک قلعہ کا دروازہ کھلا اور ایرانی بے تکلفی سے اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ بعض قابلِ فروخت چیزیں لے کر مسلمانوں کے پاس آ گئے۔ صحابہؓ کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی حیران کن تھی۔ ان کے استفسار پر ایرانیوں نے بتایا کہ اسلام کے علمبرداروں سے ہماری صلح ہو گئی ہے اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ایک ایسا خط پیش کیا جو کسی نے مسلمانوں کی طرف سے لکھ کر قلعہ کی دیوار سے اندر

پھینک دیا تھا۔

مسلمانوں نے کہا کہ ہم نے ہرگز ایسا کوئی خط نہیں لکھا اور نہ ہی تمہیں ایسی کوئی پیش کش کی ہے جس کا مقصد امن ہو ہم تو محاذ پر جنگ کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ لیکن ایرانیوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس تحریر موجود ہے۔

سالارِ لشکر کے مشورے سے جب خط لکھنے والے کے متعلق چھان بین شروع کی گئی تو معلوم ہوا یہ ایک ایرانی ہی کا کارنامہ ہے جو اسلامی کیمپ میں غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ مسلمانوں نے ایرانیوں سے کہا کہ یہ تمہارے ہی آدمی کا لکھا ہوا خط ہے جس کے ہم ذمہ دار نہیں لیکن ایرانیوں نے یہ عذر تسلیم نہ کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ خط خواہ غلام نے لکھا ہو یا آزاد نے بہر حال یہ تمہاری طرف سے موصول ہوا ہے جس کی ذمہ داری تم پہ عائد ہوتی ہے۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بہت غور و خوض کیا گیا لیکن کوئی واضح صورت سامنے نہ آئی۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس کی عہد نبوی میں کوئی مثال موجود نہ تھی۔ آخر حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھا گیا اور جو صورت پیش آئی تھی وہ ان کے سامنے بیان کی گئی۔

حضرت عمرؓ نے سالارِ لشکر سعدؓ بن ابی وقاص کو جو خط لکھا اس کا خلاصہ

یہ ہے کہ یہ بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے کہ جب تم میدان جنگ میں دشمن کو شکست دے دو۔ میدان سے اس کے پاؤں اکھڑ جائیں اور وہ تمہارے کسی اشارے کنائے سے صلح کا مفہوم سمجھ لے تو تم پر صلح کی پابندی لازم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایسی غلطی جس کے ذریعہ تم کسی کے لیے امن و سکون کا باعث بن سکو اس غلطی سے بہتر ہے جو دوسروں کی دل آزاری اور پریشانی کا باعث ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور تم اس وقت تک صحیح معنوں میں وفادار نہیں بن سکتے جب تک اس عہد کو بھی پورا نہ کرو جس کے بارے میں تمہیں شبہ ہو کہ آیا اس عہد کا پورا کرنا ہم پر فرض ہے یا نہیں۔

جس غلام نے قلعہ کے اندر صلح کا پیغام لکھ کر ڈالا تھا اگر اسے یقین نہ ہوتا کہ مسلمان اس کی پابندی کریں گے تو وہ کبھی اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈال لینے کی غلطی نہ کرتا۔ مسلمانوں کے قرب کے باعث وہ ان کے اخلاق و اعمال سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ اور یہی یقین و اعتماد اس کے خط لکھنے کا باعث بنا۔

ایرانیوں کو بھی غازیانِ اسلام کی اخلاقی بلندی پر کامل اعتماد نہ ہوتا تو وہ قابلِ فروخت چیزیں لے کر اسلامی کیمپ میں نہ پہنچ جاتے۔ اسلام کے علمبرداروں نے اخلاقی بلندی

کی جو مثالیں پیش کی تھیں ان کا دوست دشمن سب کو اعتراف تھا۔ سب ان کے گرویدہ تھے اور یہی اخلاقی قوت ان کی کامیابیوں کی ضامن تھی۔

حضرت عمرؓ کے جواب سے اخلاقی اقدار کے جو مظاہر سامنے آتے ہیں کیا ان کی کسی اور جگہ مثال مل سکتی ہے ایسی اخلاقی اقدار کی حامل قوم اگر اخلاق کے ابتدائی مقتضیات سے بھی عاری ہو جائے تو اسے حادثے کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے ؟

قلب و نظر

موقع پرست انسان ہمہ وقت ان مواقع کی تلاش میں رہتا ہے جن کے ذریعے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ رسولؐ خدا علیہ السلام کی قیادت میں غزوۂ تبوک میں شریک ہو کر ابدی سعادتیں سمیٹنے کا وقت آتا ہے تو اس کی نظر ان سعادتوں پر نہیں ہوتی بلکہ وہ مدینے کی پکی ہوئی کھجوروں کو یاد کرنے لگتا ہے۔ حق پرست انسان کو مصلحتیں عزیز نہیں ہوتیں۔ اس کی توجہ کا مرکز وہ مقاصد ہوتے ہیں جو اسے جان سے عزیز ہوتے ہیں۔ جان و مال کے زیاں کے بعد بھی اگر وہ ان مقاصد کے فروغ و ارتقاء

کا موجب ثابت ہو سکے تو اس قربانی کو طمانیت کا موجب جانتا ہے۔
مفاد پرست انسان کو مفاد حاصل کر کے خوشی ہوتی ہے۔ خواہ یہ خوشی
اسے کتنے بھی اصول و نظریات قربان کر دینے کے بعد حاصل ہو۔ وہ
مطمئن ہوتا ہے۔ اور اصول و نظریات کی تائید و حمایت کو منتہائے مقصود
جاننے والا کسی ایسے مفاد کو قبول کرنا پسند نہیں کرتا جس کے ذریعے اس
کے اصول و نظریات کو ہلکا سا نقصان پہنچنے کا احتمال بھی پیدا ہو سکے
ایک کی تگ و دو اپنے لیے ہوتی ہے اور ایک دوسروں کے لیے
زندگی گذار دیتا ہے۔ ایک کو راحتیں عزیز ہوتی ہیں اور ایک ان مشکلات
کو عزیز جانتا ہے، جو اسے راہِ حق میں پیش آتی ہیں۔ دونوں کے نظریات
الگ ہوتے ہیں۔ دونوں کے زاویۂ نگاہ میں کوئی تطابق نہیں ہوتا،
دونوں کو اپنی اپنی منزل عزیز ہوتی ہے اور وہ اسی تگ و دو میں
لگے رہتے ہیں۔ مفاد پرست انسان کو دلائل کے ذریعے کسی نظریۂ
حیات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ دل پابندی قبول کر لیتا ہے تو دلائل
کی حاجت نہیں رہتی۔ دلائل تو اس وقت کام دیتے ہیں جب ذہن
میں کوئی الجھن ہو۔ دل مطمئن نہ ہو سکے۔ دل کے اطمینان کا تعلق
حجت و برہان سے ہوتا تو وہ تمام کفار و مشرکین ایمان لے آتے جن
کے سامنے انبیاءؑ و مرسلینؑ روشن دلیلیں لے کر آئے تھے۔

ہوس انسان کو اندھا بنا دیتی ہے تو کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی کام نہیں دیتی۔ دل میں حق قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو دلیلوں کی حاجت نہیں رہتی۔ سیدھی بات بھی دل میں اتر جاتی ہے۔ اور انسان اس کی تائید و حمایت کو زندگی کا قیمتی اثاثہ سمجھنے لگتا ہے۔ انبیاء پر جو لوگ بھی ایمان لائے ہیں انہوں نے قیل و قال کے ذریعے ایمان حاصل نہیں کیا۔ لب پیغمبر سے نکلی ہوئی دعوت ان کے روح و قلب پہ اثر انداز ہو گئی اور انہوں نے اپنے تمام مفادات کو پس پشت ڈال کر ایمان قبول کر لیا۔ جو لوگ قیل و قال میں الجھے رہے اور ان کی نظر مفادات پہ رہی انہیں ہدایت نصیب نہ ہو سکی۔ ان کا ذہن نئے نئے خاکے تیار کرتا رہا اور مستقبل کی ہولناکیوں کا تصور انہیں انبیاء کی لائی ہوئی تعلیمات کی نصرت و حمایت پر آمادہ نہ کر سکا۔

آمادگی دل کا فعل ہے یہ محبت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ عقل اگر آمادگی ظاہر کرتی بھی ہے تو اپنے مفادات کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہو عقل پسپائی اختیار کر لیتی ہے۔ محبت نے پسپا ہونا نہیں سیکھا۔ پسپا ہونا اس کے نزدیک بدترین جرم ہے اور اس نے اپنی تاریخ حیات میں کبھی اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ ہی اسے مافات پہ کبھی

افسوس ہوا ہے۔ ہوس لوٹ کر بھی کف افسوس ملتی ہے کہ زیادہ ثلوٹ سکی۔
اور محبت لٹ کر بھی شاد رہتی ہے کہ سرمایہ زیست کام آیا جو محبوب
کی شان کے لائق نہ تھی اسے قبول کر لیا گیا۔ ہوس اپنے قلیل نقصان
کو بھی کثیر جانتی ہے اور محبت کثیر کو بھی قلیل سمجھتی ہے۔ یہ دونوں کے
اختلاف ظرف کا نتیجہ ہے۔ ایک کو قدرت نے کشادہ ظرفی اور کشادہ
نظری عطا کی ہے اور ایک ازل سے کم ظرف ہے۔ اس کے قلب و نظر کو
نہ کبھی وسعتیں نصیب ہوئی ہیں اور نہ ہوں گی۔

اعمال و نیّات

اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق اعمال کا دار و مدار نیت پہ ہے۔
نیت اگر بخیر ہو تو اس کا حسن اعمال کی صورت میں ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ بری
نیت اچھے اعمال کو بھی غارت کر کے رکھ دیتی ہے۔ ابن سیرینؒ جو ایک
مشہور محدث گذرے ہیں اور جنہیں خواب کی تعبیر کا خاص ملکہ عطا ہوا
تھا۔ ایک دفعہ ان سے کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے
کہ اذان دے رہا ہوں۔ ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ تم تختہ دار پر لٹکائے
جاؤ گے۔ ایک اور شخص سے یہی خواب سن کر آپ نے اسے مرجع خلائق

بننے کی بشارت دی۔ بعض لوگوں نے سوال کیا کہ ایک ہی خواب کی اس قدر مختلف اور متضاد تعبیر کیوں بیان کی گئی ہے؟ ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ خواب اگرچہ ایک ہی تھا۔ لیکن دونوں کی نیتوں میں فرق تھا، ایک بدنیت تھا۔ اور ایک نیک نیت۔ اذان باطنی کیفیت کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے جس کی نیت نیک تھی اس کی باطنی کیفیت ظاہر ہونے کے بعد لوگ اس سے عقیدت کا اظہار کرنے لگیں گے اور وہ عوام میں محبوب بن جائے گا۔ جس کی نیت فاسد تھی وہ ظاہر ہو گئی تو ننگا ہو جائے گا۔ باطن کا حال ظاہر ہونے کے بعد اس کا مقام تختۂ دار ہو گا۔

نیت کا حسن و قبح افراد کے ذاتی اعمال ہی کو متاثر نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا اثر دوسروں تک بھی پہنچتا ہے۔ کسی قوم کے رہنما نیک دل، خدا ترس، اور خدمتِ ملک و ملت کے جذبات سے معمور ہوں تو پوری قوم متاثر ہو گی۔ ایثار اس کا شعار بن جائے گا۔ خود غرض اور نفس پرست رہنماؤں کی نیت کا فساد مختلف رنگوں میں ظاہر ہو کر رہتا ہے رزق سے خیر و برکت اٹھ جاتی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی روح سکون سے محروم رہتی ہے۔ جائز و ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے کے منصوبے تیار ہونے لگتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ چاروں طرف اضطراب و انتشار پھیل جاتا ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا دامن بھر لے اور

دوسروں کو محروم کر دے۔ انسانی ہمدردی اور اخوت کے جذبات سے دل قطعی طور پہ خالی ہو جاتے ہیں، سامنے ایک انسان مر رہا ہو تو کوئی اس کے منہ میں پانی ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتا حکام کو عیش و عشرت میں مست دیکھ کر چھوٹے ملازم بھی اس ڈگر پر چل نکلتے ہیں۔ اور ان کی کوشش یہ نہیں ہوتی کہ مظلوم کی دادرسی کریں وہ ہر مظلوم اور فریادی کے لیے اللہ کریم کا عذاب ثابت ہوتے ہیں۔ مظلوموں کے لیے نئی نئی مشکلات پیدا کر کے ان کے لیے جینا حرام کر دیتے ہیں۔ یہ سب راہنماؤں کی نیت کا فتور ہوتا ہے جو پورے قافلے کو ہلاکتوں، تباہیوں اور بربادیوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ ایک نیک دل قائد کی نیک دلی اور روشن ضمیری پوری قوم کی تقدیر بدل کر رکھ دیتی ہے۔

گلستان میں شیخ سعدیؒ نے ہارون رشید کا جو واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ اپنے اندر بصیرتوں کے کس قدر سامان رکھتا ہے، سعدی کے بقول "شاہ ایک زمیندار کے باغ میں گیا شاہ کو تھکا ماندہ دیکھ کر باغ کے مالک نے انار کا رس پینے کے لیے دیا۔ انار کا افشردہ پی کر شاہ کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ جس باغ کے انار کا رس اس قدر شیریں اور خوش ذائقہ ہے کیوں نہ اسے ہتھیا لیا جائے"

نیت کے بدلنے کے بعد جب شاہ نے دوبارہ انار کا رس طلب

کیا تو اس کا نہ پہلا سا ذائقہ تھا نہ ہی انار سے پہلے کی طرح رس نکلا۔ شاہ نے باغ کے مالک سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے پہلے انار سے جو رس نکلا تھا اس سے پیالہ بھی بھر گیا تھا اور اس کا ذائقہ بھی لذیذ تھا، یہ رس کم بھی ہے اور ترش بھی"؟

باغبان نے جواب دیا معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاہ کی نیت بدل گئی ہے نیت ہی کی بدولت انار کی کیفیت میں فرق آگیا ہے۔

مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمال سے پہلے نیت کی درستگی کی جو تعلیم دی ہے اسے بعض لوگوں نے عبادات تک محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ نیت معاملات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جسے نیت کے اچھے اور برے اثرات سے مستثنےٰ قرار دیا جا سکے۔

انسانی تخلیق

گناہ میں بھی ایک لذت ہے۔ اور ثواب میں بھی، لیکن دونوں کی فطرت چونکہ جداگانہ ہے اس لیے دونوں کے اثرات بھی جدا جدا ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک سے روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے دل زندگی پاتا ہے اور ایک دل کی موت کا سامان ثابت ہوتا ہے۔ گناہ کی عارضی

لذت انسان کو باطنی طور پہ کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہے اور اس کے وجود میں وہ جاذبیت و کشش نہیں رہتی جو جوہر انسانیت کہلاتی ہے۔ اور مردہ دلوں کو زندگی عطا کر سکتی ہے۔ برگزیدہ انسان کا دل خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی روشنی عطا کر سکتا ہے جس دل میں خدا تعالیٰ کی توحید کا نور موجود ہو اس کے پاس بیٹھنے سے بھی تسکین حاصل ہوتی ہے اور ربانی انوار روحوں پہ اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سیاہ باطن انسان کا قرب بھی عذاب الیم سے کم نہیں ہوتا۔ وہ روح کو پریشان کر کے چھوڑتا ہے۔ اس کی صحبت خیر کے سرچشموں کی طرف رہنما بننے کی بجائے باطل کے ان اندھیروں کی طرف کھینچ کر لے جاتی۔ بے جہاں ظلمتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

حضور علیہ السلام سے ایک دفعہ صحابہؓ نے خدا کے دوست کی علامت دریافت کی تو حضورؐ نے فرمایا کہ خدا کا مقرب وہ ہے جسے دیکھ کر خدا یاد آئے۔

پھول کا جمال باغ کی نکہتوں کا غماز ہوتا ہے، جسے دیکھ کر باغ کی لطافتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ بندۂ حق بھی وہی کہلا سکتا ہے جس سے بندگی کی شان آشکارا ہو اور جسے دیکھ کر بندگی کا مفہوم سمجھ میں آنے لگے۔ آئینے کا جمال ذاتی نہیں ہوتا بلکہ کسی حسین کے حسن و جمال کا پرتو ہوتا

ہے۔ دل بھی جب رحمٰن کی منزل بن جاتا ہے تو حسن کے جلوے پھوٹ پھوٹ کر نکلنے لگتے ہیں۔ ذات میں بھی، صفات میں بھی حسین نظر آنے لگتی ہیں اور ذات کے حسن کے فروغ کو بھی نگاہیں محسوس کرتی ہیں۔ بجھے ہوئے چراغ سے روشنی کی توقع نہیں کی جا سکتی اور بجھے ہوئے دل سے ایمان کی حرارت کا حاصل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ آگ کی خاصیت ہی جلانا ہے۔ جو چیز بھی اس میں داخل ہو گی وہ اسے جلا دے گی، اسے اپنا مزاج عطا کر دے گی۔

بندہ بھی جب صفات ربانی میں ڈھل جاتا ہے تو مظہر ذات و صفات بن جاتا ہے تو جو بندگی صفات میں کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکے، بندے کی ذات میں اس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو، وہ بندگی نہیں، بندگی کی ایک صورت ہوتی ہے جو حقیقت سے آشنا نہیں ہوتی۔

آشنائی رسمی تعلقات کا نام نہیں یہ دل دینے اور دل لینے سے حاصل ہوتی ہے۔ جو دل دے دیتے ہیں وہ بھی آشنا ہوتے ہیں اور جو دل لے لیتے ہیں انہیں بھی بیگانہ نہیں کہا جا سکتا۔ آشنائی کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے، دونوں صاحب منزل ہوتے ہیں، دونوں صاحب حضور کہلاتے ہیں اور دونوں کو حضوری کی لذتیں حاصل ہوتی ہیں۔

نہ دل دیا جائے نہ لیا جائے نہ کسی کی رضا میں فنا ہونے کی
توفیق نصیب ہو اور نہ ہی کسی کو اپنے من میں بسایا جائے تو
یہ آشنائی کی کون سی قسم ہوگی اور اس قسم کے تعلقات سے
کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

قواعد و ضوابط

جن امور میں انسان کا انہماک بڑھ جاتا ہے قدرت کی طرف سے
انہیں سمجھنے کی اسے ایک خاص صلاحیت عطا ہوتی ہے۔ کاشت کار
کاشتکاری کے جن اسرار و غوامض سے واقف ہوتا ہے۔ وہ ایک شاعر
کی فکر رسا میں نہیں آ سکتے۔ لطیف جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے
والا شاعر لطیف جذبات و کیفیات کی ترجمانی تو کر سکتا ہے۔ لیکن زمین
کا سینہ چیر کر کھیت کو گل و گلزار نہیں بنا سکتا اور نہ ہی اس کی نظر ان
احوال و کیفیات کا جائزہ لے سکتی ہے۔ جن سے گذر کر ایک دانے کو پودا
بننے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ شاعر کے وجدان کی سطح پہ الہامات
کے جو بادل برستے ہیں، وہ ان سے واقف ہوتا ہے اور کھیتوں پر
کڑکنے والی بجلیوں اور برسنے والے بادلوں کی مزاج دانی کا ملکہ

صرف کاشتکار کو عطا ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے کی دنیا کی خبر نہیں ہوتی،
اور ایک دوسرے کے احوال و کیفیات کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے
تاجر، جو ایک پیسے سے دو پیسے بنا لینے اور ایک لاکھ کو دو لاکھ کے
سرمایہ میں ڈھال لینے کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے، وہ ایک
فلسفی اور ادیب کو نصیب نہیں ہوتیں۔ امور خواہ دنیوی ہوں یا دینی؛
جن میں انہماک زیادہ ہوگا جن کے سمجھنے اور فروغ دینے میں زیادہ
عمر صرف ہوگی۔ انہیں کی معرفت حاصل ہوگی۔ ایک کافر کو بھی انشراحِ
صدر ہوتا ہے۔ اور ایک مومن کا سینہ بھی معارفِ ربانیہ کے لیے
کشادہ کیا جاتا ہے سینے کی وسعت دونوں کو نصیب ہوتی ہے لیکن دونوں کی سمجھ
بوجھ اور سینے کی وسعت میں یہ بنیادی فرق ہوتا ہے کہ ایک کفر کے لیے وسعت
اور ایک کو ایمان کی تجلیاں سمیٹنے کے لیے عالی ظرف بخشا جاتا ہے،
جو ذہانت طغیان و سرکشی کے لیے نئی نئی راہیں کھول دے
وہ خدا کی رحمت نہیں بلکہ عذاب الیم ہوتی ہے۔ باطل کے پیٹ
سے کبھی نور پیدا نہیں ہو سکتا۔ چراغ ہی کے ذریعے روشنی حاصل
کی جا سکتی ہے۔ زنِ بازاری جب بھی بچے کو جنم دے گی وہ حرامی کہلائے
گا۔ صاحبِ نسبت وہی ہو سکتا ہے، جس کی پیدائش دینِ حنیف کے
مروجہ اصول و آئین کے تحت ہوگی، دنیا کے نزدیک حرامی اور حلالی

کی پہچان معاشرے کے لگے بندھے آئین و ضوابط کے تحت ہوتی ہے اور دین میں اسے مادر پدر آزاد سمجھا جاتا ہے۔ جس کے ذہن و ضمیر کو اسلام کی پابندی گوارا نہ ہو کر اراٹ نہیں دکھائی ہے تو اسلام کے قواعد و ضوابط سے آزاد ہو کر، اور ضمیر انکشافات کرنے لگتا ہے تو وہ بھی کسی اسلامی ضابطے کا پابند نہیں ہوتا۔

زن و شوہر کے ایجاب و قبول سے دو روحوں میں اشتراک پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بندے اور مولا کے عہدِ محبت سے دونوں میں ایک سرمدی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جو کسی طرح ٹوٹنے نہیں پاتا۔ بندے پر عہد کی پاسداری لازم ہوتی ہے اور مولا بھی اسے لاوارث نہیں چھوڑتا، ہے اس کی دعایئں سنتا ہے۔ اس کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اور اس کی عزت و آبرو کا نگہبان بن جاتا ہے۔ لیکن یہ صورت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب بندے کو بھی اپنے عہد کا پاس اور لحاظ ہو۔ آوارہ عورت خاوند کی ہمدردیوں کی مستحق نہیں ہوتی۔ آوارہ مزاج غلام آقا کی شفقت و راحت کا مستحق قرار نہیں پاتا اور آوارہ بندہ اپنے مولا کی نظروں سے گر جاتا ہے۔

بدی کی تخلیق

خدا تعالیٰ کی مصلحتوں اور حکمتوں کو سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں معرفت کے دروازے انہی لوگوں پہ کھلتے ہیں جنہیں قرب حاصل ہوتا ہے قرب حاصل کیے بغیر کسی دنیوی شاہ کی مملکت کے بھید بھی معلوم نہیں کیے جاسکتے چہ جائیکہ اس ذات کے بھید معلوم کیے جاسکیں جس کی مملکت غیر فانی ہے۔ کسی کے گھر جاکر کوئی وہاں کے نظم و نسق، وہاں کی طرز بود و باش اور مکینوں کے انداز و اطوار پہ اعتراض کرنے لگے تو صاحبِ خانہ اسے اپنی خصوصی توجہ سے نہیں نوازے گا۔ بلکہ یہ کہہ کر گھر سے نکال دے گا کہ جو خانہ تجھے بھلا معلوم ہوتا ہے وہاں چلا جا! میرے گھر ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ صاحب خانہ سے اگر نسبت خصوصی حاصل ہو تو وہ مہمان کے کہنے پر اپنے کمرے کی ترتیب میں ترمیم کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے لیکن ایک فقیر اور ایک گدا کے کہنے پہ کوئی اپنے مکان کی ترتیب بدلنے پر تیار نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ میز جس جگہ رکھی ہے اس کے رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟ مصلحتیں

تو اپنی ذات سے کامل تعلق رکھنے والوں پر واضح کی جاتی ہیں۔ ہر کہ ومہ کی بات کون سنتا ہے اور اسے کون شایانِ توجہ سمجھتا ہے؟

اللہ تعالیٰ بھی اپنی مصلحتوں کو انہی لوگوں پر واضح کرتا ہے جو اس کے مقبول بندے ہوتے ہیں، کوئی مصلحت کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کی اسے پروا نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی ہر کس و ناکس کو شریکِ راز کرنا اس کی عادت ہے۔ جو لوگ اس چکر میں پڑے رہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا، ایسا کیوں نہیں کیا؟ وہ بندگی ہی کے مفہوم سے بے خبر رہتے ہیں، معقولیت کی راہ سے بھی ہٹے ہوتے ہیں۔ آخر دنیا میں ایسا کون سا حکمران ہے جس نے اپنی ساری مصلحتیں ہر آدمی پر واضح کر دی ہوں؟ مصلحتوں کا علم تو خاصانِ بارگاہ کا حصہ ہوتا ہے۔

بہت سی چیزیں جنہیں ہم پسند کرتے ہیں، ہمارے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں اور بہت سی محبوب چیزیں ہمارے خسارے کا موجب ثابت بنتی ہیں۔ یہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ چند دن ہوئے بعض احباب میں یہ بحث جاری تھی کہ خدا تعالیٰ نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟ معترض صاحب اعتراض کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ ان کا اپنا وجود بھی غیر اہم اور غیر ضروری نہیں۔ رب تعالیٰ نے کوئی چیز بے فائدہ پیدا نہیں

کی۔ بعض ایسی چیزیں ہیں جن کی اہمیت صدیاں گزرنے کے بعد اب واضح ہوئی ہے۔ ریل گاڑی کی ایجاد سے پہلے کسے معلوم تھا کہ بھاپ میں اتنی قوت ہے۔ بجلی کا علم کسے تھا؟ ایٹم کی قوت سے کون واقف تھا؟ معلوم نہیں سبیعہ کائنات میں ابھی کتنے راز پوشیدہ ہیں جو اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہو کر انسان کو حیران و ششدر کر دیں گے۔ شیطان کے وجود کا اگر کوئی اور مصرف نہ بھی ہو تو یہی کیا کم ہے کہ وہ شیطان اور رحمان کے بندوں میں فرق و امتیاز کا موجب ثابت ہو رہا ہے۔ شیطانی قوتوں کے بغیر خدا تعالیٰ کے نیک اور مخلص بندوں کی پہچان کیسے ہو سکتی تھی؟ شاہراہوں پر ممنوعہ علاقہ لکھا ہوتا ہے۔ ان پر چلنے والا مجرم قرار پاتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان شاہراہوں پر چلنا اگر جرم ہے تو انہیں تعمیر ہی کیوں کیا گیا ہے تو اس کے فاتر العقل ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ بدی کی تخلیق بھی بے معنی نہیں بدی ایک ایسی شاہراہ ہے جسے ممنوعہ علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ جس طرح ممنوعہ علاقہ میں داخل ہونے والا حکومت کا مطیع و فرماں بردار نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی بدی قبول کرنے والے بھی مطیع نہیں ہو سکتے۔

مشعلِ ہدایت

آفتاب کی روشنی میں اندھا اور بینا دونوں سفر کرتے ہیں۔ لیکن ایک کا دل خطرے سے خالی ہوتا ہے اور منزل اس کی نگاہ میں ہوتی ہے ایک کو قدم قدم پر خطرہ لاحق رہتا۔ اسکے قدم میں بھی وہ اعتماد نہیں ہوتا جو سفر طے کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے اعتماد مسافر کی بڑی قیمتی پونجی ہوتی ہے یہ سفر میں ڈھال کا کام دیتا ہے۔ یاس سے محفوظ رکھتا ہے اور نئی تاب وتواں بخشتا ہے جو سفر کی کلفتوں سے پیدا ہونے والی بددلی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

آفتاب کی روشنی سے محروم، لاٹھی کے سہارے چلنے والا انسان ان سعادتوں سے محروم ہوتا ہے۔ جو لوگ نبوت کی روشنی کو چھوڑ کر عقل کی لاٹھی کو رہنما بنا لیتے ہیں، ان کی مثال اس اندھے سے مختلف نہیں ہوتی جو اندھے رہنما کے سہارے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور ہلاکت خیز ٹھوکریں ان کا مقدر بن جاتی ہیں۔ اندھا اندھے کا رہبر نہیں بن سکتا نادیدہ راہوں پہ چلنے کے لیے ایسے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو راستے

کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہو۔ منزل کا سراغ بھی دے اور سفر کی تھکن دور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ جہاں یاس کے اندھیرے چھائے ہوں، وہ افکار کی تجلی بکھیر کر راہوں کو منور کر دے۔ دن کا سفر طے کرنے کے لیے قدرت نے آفتاب تخلیق کیا ہے۔ رات کے راہنما ستارے ہیں اور آخرت کی منزل تک پہنچنے کے لیے نبوت کا نور مشعل ہدایت کا کام دیتا ہے۔ ہر منزل کے لیے الگ رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح ہاتھ کا کام پاؤں، اور آنکھ کا کان نہیں دے سکتے، ایسے ہی عقبیٰ کی منزل تک پہنچنے کے لیے عقل کی لاٹھی سود مند نہیں ہو سکتی۔ یہاں نبوت کا نور ہی رہنما بن سکتا ہے۔

دانا مسافر راستے میں رہنما سے الجھتا نہیں۔ بلکہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر منزل قریب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ رہنما پر اعتماد اس کے سفر کا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے گمراہ انسان کی یہ کس قدر محرومی ہے کہ وہ عقل کی رہنمائی میں آجانے کے بعد اس پر کلی اعتماد کر لیتا ہے لیکن اس پاک ذات پر اعتماد کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ جس پر خود خدا تعالیٰ کو اعتماد ہے جسے قدرت نے اپنا معتمد علیہ بنا کر بھیجا ہے۔ عقل اُخروی زندگی کا باور نہیں کرتی۔ بعث بعد الموت اور اخروی

زندگی میں پیش آنے والی حقیقتیں اس کے نزدیک ایک افسانہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور خدا تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسولؐ ان کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے جنت اور دوزخ حق ہیں میں نے انہیں دیکھا ہے نیک اعمال کی جزا پانے والوں کی راحت و سکون کی زندگی کا بھی میں نے مشاہدہ کیا ہے اور ان بد نصیب اور محروم القسمت انسانوں کو بھی دیکھا ہے جو اپنی بد اعمالیوں کی بدولت عذاب الیم کے مستحق بن چکے ہیں۔

کسی ملک کے متعلق اسی شخص کے مشاہدات معتبر ہوتے ہیں، جس نے اس کی سیر کی ہو جس نے اس کا قریب سے مطالعہ کیا ہو شنید کی بات قابل قبول نہیں ہوتی۔ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے جزا اور سزا کا جو تصور پیش کیا ہے، انسان کے آخری ٹھکانے کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کے متعلق ان کا علم یقینی ہے مشاہدے پر مبنی ہے۔ یقین کے مقابلے میں ظن و قیاس کے گھوڑے دوڑانے والی عقل کے فیصلوں کی کیا حقیقت ہے؟

حقیقت سے شناسائی اس ذات سے مل کر ہو گی۔ جو حقیقت شناس ہے جس نے تمام حقیقتوں کو بے حجاب اور بے

پردہ دیکھا ہے۔ جس نے حقیقتِ کبریٰ کے چہرے کی نقاب الٹ کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ نہ آنکھ جھپکی، نہ پتھرائی۔ بلکہ مازاغ کا سرمہ لگنے کے بعد اور زیادہ روشن ہو گئی۔ عقل کا یہاں کیا مذکور ہے؟

امتحان گاہِ محبت

محبت ہمیشہ سود و زیاں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ سود و زیاں کے جو پیمانے دنیا نے قائم کر رکھے ہیں وہ اس کے نزدیک مہمل ہوتے ہیں اس کی نظر میں ہر وہ چیز سودمند ہے جو اسے منزل تک پہنچا دے خواہ وہ کتنی ہی اذیت ناک اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو اور ہر وہ چیز نقصان دہ ہے جو دوریٔ منزل کا پیام ہو مادی اعتبار سے خواہ وہ کتنی ہی آرام دہ اور اطمینان بخش کیوں نہ ہو۔

محبت چونکہ خالصتاً ایک روحانی کیفیت ہے اس لیے وہ مادی رکاوٹوں کو برداشت نہیں کرتی کیونکہ مادی نقطہ نگاہ سے ہر معاملہ خالصتاً لین دین ہوتا ہے۔ محبت کا تصور اس سے بہت بلند ہے اغراض کی گرد بھی اس کے دامن کو نہیں چھو سکتی۔

ذاتی اغراض لے کر جو لوگ محبت کی راہ میں قدم رکھتے ہیں ان

کے پیش نظر سہولتیں رہتی ہیں۔ ہر ایسا اقدام کرنے سے گریز کرتے ہیں جس سے ان کے مفاد کو معمولی سا نقصان پہنچنے کا بھی احتمال ہو۔ لیکن محبت کی یہ فطرت نہیں، وہ سب کچھ نثار کرنے کا جذبہ لے کر اٹھتی ہے۔ راستے کٹھن ہوتے ہیں، راہ طویل ہوتی ہے تو ہمت نہیں ہارتی۔ بلکہ اس پر شباب آتا ہے، سرشاری کا عالم طاری ہوتا ہے۔ طبیعت میں ایک نئی امنگ اور ترنگ پیدا ہوتی ہے۔ جذبات نئے جوش و خروش کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ پروانے اور مکھی کی فطرت جداگانہ ہے۔ ایک کی حیات تب و تاب میں ہے، شمع کے سامنے جل کر خاک ہو جانا پروانے کے عشق کی معراج ہے، مسلسل تڑپنے، رقص کرنے اور جان دینے میں اسے جو مزا آتا ہے، وہ ہزار فلسفہ بگھارنے سے بھی کرمک کتابی کے ذہن نشین نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی دلائل کے ذریعہ اسے اس کیفیت سے آشنا کیا جا سکتا ہے۔ جذبۂ فدائیت تو ایک فطری چیز ہے۔ محبت کا فیضان ہے۔ محبت کے بغیر اسے کیسے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ عشق و مستی کی دنیا میں جب عقل کا کبھی گزر ہی نہیں ہوا، مصلحت کے جو جال اس نے اپنے گرد و پیش بن رکھے ہیں انہوں نے کبھی اسے اس کوچے میں آنے کی توفیق ہی نہیں بخشی تو وہ اس راہ کے نشیب و فراز سے کیسے آگاہ ہو سکتی ہے؟

کسی حقیقت سے آگاہی تو اس میں مبتلا ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے
تماشائیوں کو کب رازِ محبت معلوم ہوا ہے۔ وہ تو دور کھڑے ہو کر قیاس
آرائیوں سے کام لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ حجاب میں پیدا ہوتے ہیں
اور حجاب ہی میں مر جاتے ہیں۔ لذتیں، کیفیتیں اور سرشاریاں تو ان
خاصانِ بارگاہ کا حصہ ہوتی ہیں جنہیں قدرت نے عشق کی دولت
سے نوازا ہوتا ہے۔ عشق نہ ہو تو ایثار مشکل ہو جاتا ہے۔ عشق ہو تو جان
دینا بھی آسان ہو جاتا ہے جب تک سب کچھ نثار نہ کیا جائے
چین نہیں پڑتا۔

ناکامی اور کامیابی کے مادی نظریہ کو عشق کی صداقت نے یکسر بدل
کر رکھ دیا ہے۔ مادہ پرست تو تھوڑا سا نقصان بھی برداشت نہیں کر
سکتے۔ اور عشق خواہ صدقِ خلیلؑ کی صورت میں ہو، یا صبرِ حسینؓ کی صورت
میں تمام نقصانات کو برضا و رغبت برداشت کرنے کے لیے تیار ہو
جاتا ہے۔ نہ آتشِ نمرود اس کی حرارت چھین سکتی ہے اور نہ ہی یزید کی
شقاوت اس کے عزم کو متزلزل کر سکتی ہے۔

سہولتوں کے سامان دونوں جگہ ہو سکتے تھے۔ امتحانِ خلیل کے
وقت بھی، اور امتحانِ حسینؓ کے وقت بھی، لیکن عشق نے کبھی سہولت
کو کب قبول کیا ہے؟ رعائتیں تو ہوس طلب کرتی ہے۔ عشق کی منزل

ان پنہنیوں سے بہت بلند ہوتی ہے۔ وہ امتحان گاہِ محبت سے کامیاب
ہو کر نکلتا ہے تو کونین کی عظمتیں اس کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتی
ہیں۔

تپش و گداز

جس چراغ میں لو آجاتی ہے، وہ پروانوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا
ہے اور جو دل خدا کی یاد میں جلتا ہے، اس پر خدا کی رحمت نثار ہونے
لگتی ہے۔ بجھے ہوئے چراغ کے گرد پروانوں کا رقص نہیں ہوتا، اور
بجھے ہوئے دل کا رحمت طواف نہیں کرتی طواف اسی دل کا کرتی ہے، جس میں نور ہو روشنی ہو

جلتے چراغ دوسروں کو ٹھوکر سے بچاتے ہیں، منزل کا سراغ
دیتے ہیں اور جلتے دل ایمان کی حرارت بخشتے ہیں۔ محبت سفر میں مسافر
کی تھکن دور کرتا ہے۔ اسے مشتعل کر کے سفر کیلئے آمادگی بخشتا ہے۔ دل کا نغمہ بھی
عقبیٰ کے مسافر کے لیے اشتعال کی حیثیت رکھتا ہے اس سے تھکن بھی دور
ہوتی ہے اور قدم بھی تیز اٹھنے لگتے ہیں۔ مردے سے نغمے کی توقع نہیں کی
جا سکتی اور مردہ دل محبت کے جذبات کا خالق نہیں بن سکتا، زندہ
دل کے ساز ہی سے وجد انگیز نغمات پھوٹ سکتے ہیں، اور زندہ دل
ہی ان کی گرمی محسوس کر سکتا ہے نمک پانی میں گر کر تحلیل ہو جاتا ہے،

پتھر تحلیل نہیں ہوتا اس میں تحلیل ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔
اثر قبول کرنے کے لیے صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ ابوجہل
میں صلاحیت نہ تھی، وہ جمال دیکھنے کے بعد بھی محروم رہا۔ اور
صدیقؓ کے دل میں چوں کہ صلاحیت موجود تھی، اس لیے
پگھل گیا۔ گداز ہو گیا۔

سورج کی گرمی، پھلوں میں رس، بو اور مزہ پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن
حشرات الارض اسی گرمی سے مر جاتے ہیں۔ یہی گرمی ایک کے لیے زندگی
کا پیام ثابت ہوتی ہے اور ایک کے لیے پیام مرگ بن جاتی ہے۔

چراغ کی لو خواہ کتنی بھی تیز ہو، فطری سوز سے محروم پتنگوں کو وجد
میں نہیں لا سکتی۔ رقص اور وجد پروانوں ہی کا حصہ ہوتا ہے۔ سوز
بھی وہی حاصل کرتے ہیں۔ اور نثار بھی وہی ہوتے ہیں۔ پروانہ صرف چراغ
کی لو کے گرد ہی طواف نہیں کرتا مٹی کے جس چراغ میں تیل ہو اس کا بھی
طواف کرتا ہے۔ دل بھی نورِ الٰہی سے فیض یاب ہو، تو رحمت اسی کا طواف
نہیں کرتی خاک کے پتلے کا بھی طواف کرنے لگتی ہے۔ بتی کے بغیر چراغ
روشن نہیں ہو سکتا۔ چراغ کی ساری لو اس رشتے کی منت پذیر ہوتی ہے
جو تیل اور نور کے درمیان واسطہ بنا ہوتا ہے۔

بندے کا بھی جب مولا سے تعلق جڑ جاتا ہے تو دل میں

روشنی پیدا ہونے لگتی ہے۔ محبت قابل تعلق کے ذریعے نور بن کر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اور آخرت کی منزل کے مسافر کو اپنی راہیں فروزاں اور تاباں نظر آنے لگتی ہیں۔ محبت ہی نہ ہو تو جلے گا کون؟ تعلق ہی نہ ہو تو شعلہ بن کر فروزاں کون ہوگا زندگی کی راہوں میں نور کون پھیلائے گا تاریکیاں تو نور سے مٹتی ہیں۔ ظلمتیں تو روشنی سے دور ہوتی ہیں تپش اور گداز بھی جلنے کے بعد ہی حاصل ہوتے ہیں۔ جلنا اور جلانا، نور حاصل کرنا اور نور بخشنا، زندگی کا مقصود بن چکا ہو تو یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ سامان ناگزیر ہو جاتا ہے، جو جلنے جلانے، روشنی حاصل کرنے اور روشنی پھیلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر نہ روشنی ملتی ہے اور نہ تپش و گداز کی لذت سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے

بندہ نوازی

ابن سیرینؒ سے کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں آسمان سے سفید پرندے اترتے دیکھے ہیں۔ جو ایک گھنے درخت پر آکر بیٹھ گئے ہیں اور

اس کے پتوں کو کھا گئے ہیں، یہ سن کر فرمانے لگے کہ اس دور کے کسی عالم دین کا انتقال ہو جائے گا۔ سفید پرندوں سے مراد فرشتے ہیں اور گھنا درخت کوئی ایسا عالم دین ہے جس کے سائے میں تپتی ہوئی روحوں کو آسودگی ملتی تھی۔ چنانچہ زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ امام حسن بصریؒ کے انتقال کی خبر آگئی جو اپنے وقت کے یگانۂ روزگار عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ حجاج بن یوسف جیسے ظالم اور سفاک حکمران کی ستائی ہوئی مخلوق کے لیے تسکین کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ جس مظلوم کو اپنا غم سننے والا اور تسکین دینے والا مل جائے وہ خوش نصیب ہوتا ہے۔ قابلِ رحم تو اس انسان کی محرومی ہوتی ہے جس کا سینہ زخموں سے معمور ہو اور اسے آنسو پونچھنے والا دامن نہ مل سکے۔ بعض اوقات جب دل پر غم و آلام کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور شدت یاس میں چاروں طرف ظلمتوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تو پرسش غم بھی مداوا سے کم نہیں ہوتی چند تسلی آمیز الفاظ سن کر بھی انسان کی ڈھارس بندھ جاتی ہے اور اسے مستقبل کے افق پر کئی چراغ فروزاں نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی لیے اسلام نے کلمہ خیر کہنے کی ہدایت کی ہے اور اسے بھی عظیم عمل قرار دیا ہے۔ مظلوم کی مدد کرنا اگر دسترس سے باہر ہو تو انسان خدا تعالیٰ کی دی ہوئی زبان کے ساتھ چند خیر کے کلمات ہی کہہ کر عظیم اجر کا مستحق

بن سکتا ہے۔ احساس کی دولت سے سینہ معمور ہو تو دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے تسلی کے چند الفاظ بھی دکھیا دلوں کے لیے مرہم ثابت ہوتے ہیں۔ شقی انسان جو فطرتاً رحم و کرم کے جذبات سے محروم ہو۔ وہ کسی انسان کو جھوٹی تسلی کبھی نہیں دے سکتا اور خدا تعالیٰ کے مقبول بندے جو کسی کی مدد نہ بھی کر سکیں۔ زبانی ہمدردی سے دریغ نہیں کرتے۔ شقاوت جب خود خدا تعالیٰ کے عذاب کی لپیٹ میں آجاتی ہے تو تنکوں کا سہارا تلاش کرتی ہے۔

جو انسان عذاب کے طور پر مصیبت میں مبتلا نہ کیا گیا ہو۔ بلکہ اس کی یہ مصیبت درجات کی بلندی اور آزمائش کی حیثیت رکھتی ہو۔ اسے تسکین دینے والے مل جاتے ہیں۔ شقی انسان کی مصیبت پر کسی کا دل نہیں کڑھتا۔ کسی کی آنکھ نمناک نہیں ہوتی اور کوئی ہاتھ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے نہیں بڑھتا۔ اپنے غم پر کسی آنکھ کی نمناکی اور کسی کا قلق و اضطراب خدا کی رحمت ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے دل میں رحم و کرم کا جذبہ پیدا نہ ہو تو کون کسی کے غم میں روتا ہے؟ کون کسی کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے؟ یہ سب رحم کی علامتیں ہیں۔ بندہ نوازی کے انداز ہیں اور کریمی کی شان ہے۔ جس سے شقاوت ہمیشہ محروم رہتی ہے۔

بصیرتیں

جن نفوسِ قدسیہ کو خدا تعالیٰ نے اپنے دین کی نصرت وحمایت کے لیے صبحِ ازل چن لیا تھا اور وہ نبوت کے مخاطبِ اوّل قرار پائے تھے۔ ان کا ہر قول وفعل زندگی کی شاہراہوں میں مشعلِ ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مجسم عمل بن کر سامنے آئے تھے اور ان کے اقوال بھی ظلمتوں میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صحابہ کا امت پر یہی کرم کیا کم ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً حضورؐ سے دقیق مسائل کے متعلق استفسار فرماتے رہتے تھے۔ حضور ان کے سوالات کے جو جواب دیتے تھے، وہ پوری امت کے لیے فوز وفلاح کے ضامن ہیں۔

صحابہؓ کی توجہ اپنی ذاتی مسائل کی الجھنوں کے حل کرنے پر مرکوز نہ تھی۔ حضورؐ سے وہ جو سوال بھی کرتے تھے وہ نوع انسانی کی فلاح وفوز سے متعلق ہوتا تھا۔ ایک دن حضورؐ صحابہؓ میں تشریف فرما تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگلی امتوں میں سے کوئی عجیب واقعہ بیان فرمایئے۔

حضورؐ نے فرمایا اگلے زمانے کے تین آدمی مل کر سفر کو روانہ ہوئے شام کو انہیں پناہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تو انہوں نے ایک غار میں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا غار میں وہ قیام پذیر تھے کہ ایک پتھر گرنے کے باعث غار کا منہ بند ہو گیا۔ اور ان کے باہر نکلنے کی راہ مسدود ہو گئی ان میں سے ایک نے کہا کہ نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی اور اب ہماری موت یقینی ہے۔ ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے کہ ہم میں سے جس شخص نے کوئی نیک عمل کیا ہے اسے وسیلہ بنا کر خدا کی بارگاہ میں دعا مانگے کہ وہ ہمیں نجات دے۔

چنانچہ یہ تجویز پسند کر لی گئی۔ اور ان میں سے ایک بولا کہ میرے ماں باپ بہت ضعیف تھے۔ میں انتہائی مفلس تھا۔ میرا معمول یہ تھا کہ جنگل سے لکڑیاں لا کر فروخت کرتا اور اس کی قیمت سے غذا لا کر ان بکریوں کے دودھ میں بھگو دیتا۔ جو میرے پاس موجود تھیں، غذا نرم ہو جاتی تو بوڑھے ماں باپ کو کھلاتا۔ ایک دن مجھے لکڑیاں لانے میں دیر ہو گئی۔ جب میں نے غذا لا کر دودھ میں بھگونے کے بعد نرم کی اور میں اپنے والدین کو کھلانے کے لیے گیا تو وہ سو چکے تھے۔ مجھے سخت قلق ہوا۔ اور میں غذا کا پیالہ لے کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا ان کے بیدار ہونے کے انتظار میں صبح تک کھڑا رہا۔ وہ سو کر اٹھے تو میں

سے غذا پیش کی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اس نے کہا کہ ہماری ظاہری اور باطنی کیفیات کو جاننے والے قادر و قیوم۔ اگر میں اپنے اس بیان میں صادق ہوں تو ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما۔ حضور علیہ السلام نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اس شخص کی دعا خدا نے قبول کی اور غار کے دہانہ سے تھوڑا سا پتھر سرک گیا۔ لیکن سوراخ اتنا نہ تھا کہ وہ باہر نکل سکتے۔

حضورؐ نے فرمایا ان میں سے دوسرے نے کہا۔ مجھے اپنی چچازاد بہن سے عشق تھا۔ لیکن وہ میری طرف التفات نہ کرتی۔ ایک دفعہ میں نے اسے حیلوں بہانوں سے راضی کر لیا۔ اور ایک معقول رقم بھی پیش کی جب وہ رات کے وقت میری خلوت میں آئی اور میں نے بدی کا ارادہ کیا تو میرے دل پہ خدا کا خوف غالب آگیا اور مجھے خدا نے معصیت سے محفوظ رکھا۔

حضورؐ نے فرمایا کہ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اس نے خدا سے نصرت چاہی اور پتھر تھوڑا سا اور سرک گیا لیکن ابھی تک وہ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

تیسرے نے کہا۔ کہ میرے پاس کچھ مزدور کام کرتے تھے۔ ان

میں سے ایک مزدور اجرت لیے بغیر چلا گیا۔ میں نے اس کی بہت تلاش کی لیکن وہ نہ ملا۔ اس کی اجرت کے پیسوں سے میں نے ایک بھیڑ خرید لی۔ اور چند سال تک اسے اپنے پاس رکھا۔ اس دوران میں اسکے جتنے بچے پیدا ہوئے انہیں بھی اسکے ساتھ محفوظ رکھا۔ چند سال بعد مزدور نے آکر مجھ سے اجرت کا مطالبہ کیا۔ تو میں نے ان بھیڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہاری اجرت یہ ہے لیکن میں نے اسے تسلی دے کر یہ تمام بھیڑیں اس کے حوالے کر دیں۔

حضور نے فرمایا کہ اپنے اس عمل کا ذکر کرنے کے بعد اس نے دعا مانگی تو وہ قبول ہو گئی اور غار کا پتھر سرک گیا۔ اور وہ تینوں باہر نکل آئے۔ یہ حدیث احادیث کے مجموعوں میں حدیث الغار کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں جو بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔ وہ اہل دل سے پوشیدہ نہیں۔

پرویزی حیلے

ایک صاحب جو بڑے طمطراق سے پرویزی شان دکھانے کے لیے اٹھے ہیں۔ ان بزرگان دین سے بہت ناراض ہیں۔ جنہوں نے

حدیثِ نبوی کی تدوین و ترتیب کی ہے اور حق کے فروغ کے لیے جانکاہیوں سے کام لیا ہے۔ محدثین کو یہ عجمی سازش کا شکار بتاتے ہیں اور بزرگانِ دین سے ان کی برہمی کا باعث یہ ہے کہ انہوں نے اپنا نام صوفی رکھ لیا تھا۔ حالانکہ یہ نام صدرِ اوّل میں نہیں تھا۔

نام کی بحث میں الجھنا کوئی معقولیت نہیں کیونکہ بہت سی ایسی حقیقتیں ہیں جو صدرِ اوّل میں پائی جاتی تھیں، اس وقت ان کا نام اور تھا، اب اور نام سے موسوم ہیں۔ نماز، روزہ بھی عربی الفاظ نہیں۔ یہ خالصتاً عجمی ہیں۔ لیکن کیا کوئی معقول آدمی ان کے نام کی تبدیلی کے باعث ان سے انکار کر سکتا ہے؟ اسم کا انکار مسمّٰی کے انکار کو مستلزم نہیں ہوتا کیونکہ اسم اور مسمّٰی ایک چیز نہیں۔ اسم کے انکار سے مسمّٰی کی حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا، ورنہ جانیے۔ لفظ پرویز ہی کو لے لیجیے، یہ ہماری ملی تاریخ کا ایک مکروہ ترین لفظ ہے۔ یہ ایران کے اس شاتمِ رسولؐ بادشاہ کا نام تھا جس نے رسولِ اکرمؐ کا نامہ گرامی چاک کر دیا تھا، اور وہ عتابِ نبویؐ کا مورد بنا تھا۔

لفظ محدّث اور صوفی پہ بگڑنے والے ایک دشمنِ رسولؐ کے نام کو تو برداشت کر لیتے لیکن انہیں محدث اور صوفی کے نام سے کد ہے۔ ان کے خلاف یہ کہہ کر سارا زورِ قلم صرف کر رہے ہیں کہ انہوں

نے اسلام کی کوئی خدمت نہیں کی۔

ان کرم فرماؤں کے نزدیک اگر خدمتِ دین کا مفہوم یہ ہے کہ ان بزرگوں نے کوئی ماہنامہ جاری کر کے اپنے اسلاف کی عظمتوں کو مٹانے کی کوشش نہیں کی انہیں عجمی سازشوں کا شکار نہیں قرار دیا۔ غیر مسلم حکومت کے ایک ایسے شعبے کا انچارج بننا قبول نہیں کیا جس کے ذمے ملت کی مخبری کے فرائض تھے، بے پردہ اور نیم عُریاں خواتین میں بیٹھ کر اسلام کی نئی تعبیر و تفسیر نہیں کی۔ تو ہمیں اعتراف ہے کہ ان کا دامن اُن خدمات سے خالی ہے۔ ان کے تقوے کا تو یہ عالم تھا کہ کافرانہ نظام کا کل پرزہ بن کر ملت کی مخبری کرنا تو ایک طرف رہا، وہ تو مسلمان حکمرانوں کی بارگاہوں میں قاضی بننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ایسے مناصب کو استحقار سے ٹھکرایا اور حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اپنی پشتوں پہ درّے کھائے ہیں۔ لیکن زبان کو باطل کی تائید میں نہیں کھلنے دیا۔ حق کی تائید و حمایت کے لیے جو ذرائع بھی ان کے امکان میں تھے انہیں بروئے کار لائیں۔ جہاد کا وقت آیا تو دنیا نے انہیں مختلف محاذوں پر دادِ شجاعت دیتے ہوئے دیکھا۔ رزم گاہوں میں ان کی تلواریں چمکیں۔ ان کے عزائم نے باطل کے پرچم کے نیچے کھڑے ہو کر لڑنے والے جانبازوں کے عزائم

کو شکست دی۔ فکر و تدبیر کا وقت آیا تو ان کی فکر صائب ثابت ہوئی۔ ان کے ناخن تدبیر نے لاینحل عقدے کھولے اور انہی کی فکر کی رہنمائی میں ملت قافلہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے دامن میں فکر و خیال کا جو بھی سرمایہ ہے۔ جسے ہم اپنی قیمتی متاع سمجھتے ہیں، اور جس کی تابندگی اور تابانی ہمیں فکر و خیال کی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے، یہ انہی کی عطا ہے۔ انہی کا کرم ہے، انہی کی نوازش ہے۔ ایک کور چشم کو آفتاب کی تابانی نظر نہ آئے تو یہ آفتاب کا قصور نہیں۔ بصارت و بصیرت سے محرومی انسان کو کئی زندہ و پائندہ حقیقتوں کا انکار کر دیتی ہے۔

چند مظاہر

میر و سلطان کی بارگاہ میں حق بات کہنا بڑا مشکل کام ہے۔ جب کسی صاحبِ اقتدار کے سامنے اس کی خواہشات کے علی الرغم حق بات کہنے کا مرحلہ پیش ہو، تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایمان اگر محکم نہ ہو اور خدا کی توفیق شاملِ حال نہ ہو، تو انسان اس مرحلے سے آسانی سے نہیں گزر سکتا۔

بندے کا مقصود جب رضائے الٰہی بن جاتا ہے تو اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے حق بات کہنے سے اقتدار کی جبیں پر شکن

پڑنے کا اندیشہ ہے جان کا خطرہ مول لے کر بھی وہ یہ فریضہ ادا کرتا ہے۔

جن دنوں امام محمدؒ قاضی القضاۃ تھے۔ انہیں بار ہا ان مراحل سے گزرنا پڑا۔ لیکن مطلق العنان شاہ کی برہمی کا خیال انہیں حق گوئی سے باز نہ رکھ سکا۔

ایک دفعہ ہارون رشید نے ان سے کہا کہ حضرت عمر فاروق نے بنو تغلب سے اس شرط پہ مصالحت کی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی نہیں بنائیں گے لیکن وہ اس شرط پہ قائم نہ رہ سکے انہوں نے اپنی اولاد کو عیسائی بنا لیا۔ تو کیا انکی بدعہدی کے باعث ان کا خون بہانا جائز ہے؟ "امام محمد نے فرمایا"

یہ درست ہے کہ بنو تغلب اپنے عہد پہ قائم نہیں رہے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو عیسائی بنا لیا تھا۔ لیکن حضرت عثمان نے چونکہ ان سے تعرض نہیں کیا، اس لیے ان سے تعرض کرنا درست نہیں۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ کو کتاب و سنت کا جو علم تھا، وہ ہمیں نہیں۔ خدا اور رسولؐ کی منشا کو وہ ہم سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ان کے بعد اسی فیصلے کو برقرار رکھا گیا۔ اس لیے اب اگر آپ ان کا خون بہائیں گے، تو یہ صریحاً ظلم ہوگا

امام محمدؒ کی حق گوئی کا یہ اثر ہوا۔ کہ بنو تغلب کی جان بچ گئی اور ہارون رشید نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔

ہارون رشید کو ایک دفعہ یہ اطلاع ملی۔ کہ کچھ لوگوں نے اس

کے خلاف شورش برپا کر رکھی ہے، اور وہ عوام کو اس کی حکومت کے خلاف بھڑکا رہے ہیں، اس نے انہیں گرفتار کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ روانہ کیا۔

باغیوں کو پکڑ کر بغداد لایا گیا۔ ہارون رشید کا قیام چونکہ ان دنوں رقہ تھا، اس لیے باغیوں کو رقہ بھیج دیا گیا۔

جب ہارون رشید کے سامنے انہیں پیش کیا گیا، تو اس وقت امام محمدؒ بھی قاضی القضاۃ کی حیثیت سے اس کے قریب بیٹھے تھے امام محمد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ باغیوں کی جماعت میں حضرت امام شافعیؒ بھی ملزم کی حیثیت سے موجود ہیں۔

ہارون رشید نے ایک ایک ملزم سے یہ پوچھنے کے بعد کہ تم نے میرے خلاف بغاوت کیوں کی۔ انہیں قتل کرا دیا۔

اب امام شافعی کی باری تھی۔ ہارون رشید نے جب ان سے پوچھا کہ تم نے بغاوت کیوں کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں باغی نہیں اور نہ ہی مجھے ایسی سازشوں سے قطعاً کوئی لگاؤ ہے میرا طبعی میلان علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کی طرف ہے سپاہی مجھے کسی غلط تاثر کی بناء پر پکڑ لائے ہیں۔

امام شافعیؒ نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا: یہ صاحب

جو قاضی القضاۃ کی حیثیت سے آپ کے پاس بیٹھے ہیں، مجھے جانتے ہیں۔ ان سے پوچھ لیجیے، میں باغی نہیں۔

ہارون رشید نے امام محمد کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا آپ کی ان کے متعلق کیا رائے ہے؟

امام محمد نے فرمایا۔

"یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، صحیح ہے۔ اپنی دینی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے انتہائی کسر نفسی سے کام لیا ہے، ان کا علمی پایہ بہت بلند ہے، اور ان کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے ایک نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ باغیوں کو سزا کا حکم دیتے وقت ہارون رشید بہت غضب ناک تھا، لیکن امام محمدؒ نے پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ ان کے اوصاف بیان کیے اور انہیں بچا لیا۔

ہارون رشید کی رضا جوئی کی نسبت امام محمد کے نزدیک امام شافعیؒ کا خون زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔

امام شافعیؒ سے امام محمدؒ کی یہ دلچسپی دیکھ کر ہارون رشید نے امام محمد سے کہا کہ اچھا آپ انہیں اپنے ساتھ لے جائیے۔ ان کے ذمہ دار آپ ہیں۔

امام شافعیؒ کو نجات دلانے کے بعد امام محمد نے مدتوں انہیں اپنے پاس رکھا۔

بوترابی حکمتیں

حضرت علیؓ سے کسی نے کہا، کہ مسئلہ جبر و قدر پر روشنی ڈالیے چنانچہ انہوں نے فرمایا، کھڑے ہو جاؤ!

سائل کھڑا ہو گیا، تو آپؓ نے فرمایا ایک ٹانگ اٹھا لو! اس نے ایک ٹانگ اٹھالی تو بولے کہ دوسری بھی اٹھا لو! اس نے جواب دیا، کہ دوسری کیسے اٹھا سکتا ہوں؟ دوسری اٹھائی تو گر جاؤں گا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ بس یہی جبر و قدر ہے۔ بعض امور کا تجھے اختیار دیا گیا ہے اور بعض تیرے اختیار میں نہیں۔ قیامت کے دن محاسبہ انہی امور کے متعلق ہو گا جو تیرے اختیار میں ہیں، غیر اختیاری امور کے متعلق سوال نہیں ہو گا۔

حضرت علیؓ مکان کی چھت پہ کھڑے تھے، نیچے سے ایک یہودی گزرا جس نے امیر علیہ السلام کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا کہ موت کا وقت مقرر ہے؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ تو وہ بولا، کہ موت وقتِ مقررہ پہ آئے گی تو مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دو آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

امیر علیہ السلام نے جواب دیا کہ چھت سے گر کر مرنا، اگر میرے مقدر میں نہیں تو میں گر جانے کے بعد بھی زندہ رہوں گا۔ لیکن میرا خدا تعالیٰ پہ کامل یقین ہے۔ اور مجھے اپنے مولا کو آزمانے کی ضرورت نہیں، ایسا تجربہ تجھے کرنا چاہیئے مجھے تو تجربے کی ضرورت نہیں میں تو اپنے مولا کو قادرِ مطلق سمجھتا ہوں۔

ایک دفعہ امیر علیہ السلام کی موجودگی میں بعض علمی مباحث چھڑ گئے۔ ایک شخص نے عقل و نقل کی بحث کا آغاز کر دیا۔ اس کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ تمام شرعی امور عقل کے مطابق ہیں۔

امیر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ کس کی عقل کے مطابق؟ تمہاری عقل کے مطابق؟

اور پھر سائل پر اس کی غلطی واضح کرنے کے لیے بولے، کہ شریعت نے موزے پر مسح کرنے کا حکم کر دیا ہے حالانکہ عقل کا اقتضا یہ ہے کہ موزے کے نیچے مسح کیا جائے، تاکہ چلنے پھرنے سے جو غلاظت لگ گئی ہو، وہ دور ہو سکے۔ لیکن شریعت ہماری عقل کی پابند نہیں۔ موزے کے نیچے مسح کرنے کی بجائے اوپر مسح کرنے کی مصلحتیں ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، وہ ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہیں۔ ان سے انحراف ممکن نہیں۔

امیر علیہ السلام نے موزے پہ مسح کرنے کی جو مثال پیش کی ہے، وہ

عقل کے بندوں کو جھنجھوڑنے اور ربانی حکمتوں کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کس قدر اہمیت رکھتی ہے! امیر علیہ السلام اور ان کی طرز کے فکرِ سلیم رکھنے والے بزرگوں کو کبھی موزے پر مسح کرنے کے متعلق کوئی اشکال پیدا نہیں ہوا۔ اشکال وہیں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں دوسری ذات کو ناقص سمجھا جاتا ہے۔ کامل ذات کے صادر کیے گئے امور کی حکمت و مصلحت تک ذہنِ انسانی کی رسائی ہو یا نہ ہو، وہ ان کے متعلق کسی شک و شبہے میں مبتلا نہیں ہوتا۔ شک و شبہ دل میں جگہ پانے لگے، تو اس کا یہ مفہوم ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنے سامنے والی ذات کو کامل نہیں سمجھتا۔ اور اسی کا نام اسلامی اصطلاح میں کفر ہے۔ ایمان راسخ ہو جائے، تو شک و شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ہجرت کے وقت امیر علیہ السلام بسترِ رسول ص پہ لیٹ گئے تھے۔ تو کوئی شبہ ان کے قریب نہیں پھٹک سکا۔ انہیں خطرات میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود بسترِ رسول ص پر نیند آگئی۔ یہ محبت ہی کا خاصا ہے کہ وہ خطرات میں گھِر کر بھی اطمینان کی نیند سو سکتی ہے۔ عقل کو ایسے وقت کہاں نیند آسکتی ہے؟ اسے تو معمولی خطرہ بھی بے چین کر دیتا ہے بلکہ وہ تو ازل ہی سے بے چین ہے اور بے چین رہے گی۔

عید اور فطرانہ

مومن کو ہر نعمت کے حصول کے بعد شکر کی تلقین کی گئی ہے عید کے دن مسلمان عید گاہ میں جمع ہو کر جو سجدہ ریز ہوتے ہیں دراصل یہ اس نعمت کا شکر ہوتا ہے جو انہیں روزوں کی صورت میں عطا ہوئی بخشش و رحمت کے اس مہینے میں جو بادل گھر کر برسے اور دلوں کو نئی زندگی عطا کر گئے اس کی خوشی کا نام عید ہے

اس سے بڑھ کر اور خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ بندہ اطاعت کی راہ سے گزر کر اپنے مولا کی منزل میں داخل ہو جائے غلام کو خواجہ کی خوشنودی کی سند عطا ہو، مہینہ بھر بھوکا پیاسا رہ کر خواہشات کو قربان کرنے کے بعد مسلمان جب عید گاہ کی طرف نکلتا ہے تو اس کا دل اس احساس سے لبریز ہوتا ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی طرف سے عائد کئے گئے فریضے کو ادا کرنے کے بعد اس کی بارگاہ کی حاضری دے رہا ہے۔

اعلیٰ بارگاہ میں حاضری کے وقت اعلیٰ لباس کی ضرورت ہوتی ہے اور آج بارگاہ صمدیت میں حاضری دینے والے غلام کا لباس ہی ستھرا نہیں مسلسل ایک ماہ کے روزوں اور قیام لیل نے اس کی باطنی کدورتوں کو بھی دھو ڈالا ہے۔

ظاہر کو دیکھنے والی کی بارگاہ میں صاف ہونا ضروری ہوتا ہے اور جس قادر و قیوم کی نگاہ سے باطن کی کوئی کیفیت و حرکت پوشیدہ نہ ہو اس کی بارگاہ میں ظاہر کے ساتھ باطن کا پاک صاف ہونا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے خلوص نیت کے ساتھ روزے رکھے اور ان کے تمام شرائط لوازم کو پورا کیا ان کے دل معصیت کی اس گرد سے پاک ہو چکے ہیں جو گناہوں کے باعث ان کے قلب کو محیط تھی ایسے ہی لوگ عید کی حقیقی مسرتوں کے مالک ہیں ظاہر کے ساتھ انہوں نے باطن کو بھی کرم کے قابل بنا لیا ہے اور ایسے ہی لوگ قابل رشک ہیں۔ برستے بادلوں میں جو شخص اپنے چہرے کا گرد و غبار نہ دھو سکے وہ قابل ستائش نہیں موسلا دھار بارش میں چہرے کی سیاہی لے کر گھر لوٹنے والا مسافر انتہائی محروم القسمت ہوتا ہے اور جو لوگ رحمت کی رم جھم میں دل کے داغ نہیں دھو سکتے ان کی محرومی قابل ماتم ہوتی ہے۔ رحمت ہوتی ہی گرتوں کو سہارا دینے اور ڈوبتوں کو بچانے کے لیے ہے۔ رحمت سے منہ موڑنے والا ہر جگہ خائب و خاسر رہتا ہے۔

روزہ رکھ لینے اور عید کی نماز ادا کر لینے ہی سے وہ مقصد پورا نہیں ہو جاتا جو خدائے علیم و حکیم کے پیش نظر ہے روزوں کے ذریعہ خدا مومن میں تقویٰ کی شان پیدا کرنا چاہتا ہے اور تقویٰ فاقہ کشی کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ

مال خرچ کرنے سے بھی حاصل ہوتا ہے اسی لیے بارگاہ صمدیت میں حاضری سے قبل صدقہ فطرادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

خدا تعالیٰ کی توفیق شامل حال نہ ہو تو انسان لاکھوں اور کروڑوں کا مالک ہونے کے باوجود خدا کی راہ میں ایک پیسہ خرچ کرنے سے بھی گریز کرتا ہے۔ توفیق نصیب ہو تو سب کچھ لٹا کر بھی ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی صاحب ایثار چونکہ سب نہیں ہوتے اس لیے فطرانہ کی نہایت حقیر مقدار مقرر فرمائی ہے یہی مقدار اگر پورے التزام کے ساتھ ادا کی جائے اپنے محلے کے غربا، مساکین بیوہ اور یتامیٰ کو ان کا وہ حق دیا جائے جو خدا نے ہر صاحبِ نصاب روزہ دار کے مال میں مقرر فرمایا ہے تو وہ بھی عید کی مسرتوں میں شریک ہو سکتے ہیں صدقہ فطرادا کرنے سے ہمیں ان ناداروں کا تعارف بھی حاصل ہو سکتا ہے جن سے قریب رہنے کے باوجود ہم ان سے اور ان کی حالت سے بے خبر ہیں مہینہ بھر بھوکا پیاسا رکھ کر امیروں کو غریبوں کی حالت کا احساس دلا دیا گیا ہے اور پھر صدقہ فطر کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس طرز تعلیم کو بھی کوئی نہ سمجھے تو خدا کو اس کے روزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

مردود اور مقبول

امام حسن بصریؒ جن دنوں اموی عہد میں مصیبت کے دن کاٹ رہے تھے۔ ان کے سامنے گوناگوں مشکلات تھیں۔ اموی حکام نے انہیں تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اور بصرے کے وہ شہدے اور کمینے بھی ان کے در پے آزار تھے۔ جن کا بظاہر حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ حسن بصری کو اپنے تفنّن کا موضوع بنا کر اپنے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ انہی شہدوں میں حسن بصریؒ کو بوڑھی ملازمہ کا جواں سال بیٹا بھی شامل تھا۔ جو ماں کی خواہشات کے علی الرغم حسن بصریؒ کو ایذا پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ ضعیفہ بے حد کبیدہ خاطر تھی کہ ہونہار کس ڈگر پہ چل نکلا ہے؟ اسے تو حسن بصریؒ کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔

ضعیفہ کو جب یہ معلوم ہوتا کہ اس کا بیٹا شہدوں اور کمینوں کی محفل میں بیٹھ کر حسن بصریؒ کے تقدس کا مذاق اڑاتا ہے، ان جیسا لب و لہجہ اختیار کر کے ان کی نقل اتارتا ہے تو اس کا دل خون ہو جاتا ہے اور وہ بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کرتی لیکن نوجوان اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوسکا۔

اس کی توجہ حسن بصری کو ایذا دینے ہی پر مرکوز تھی، اور اسے انہیں ایذا دینے ہی میں راحت محسوس ہو رہی تھی۔

اتفاق سے نوجوان بیمار ہو گیا، اور اس کی علالت نے شدت اختیار کر لی۔ کافی علاج معالجے کے بعد بھی شفا نہ ہوئی تو اس نے ایک دن کراہتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا یہ درد و کرب اور قلق و اضطراب خدا کے عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے حسن بصری کی مخالفت کی سزا مل رہی ہے جب تک مجھے وہ معاف نہیں کریں گے، مجھے شفا نہ ہو گی۔

نوجوان نے والدہ سے کہا، کہ آپ حسن بصریؒ کے پاس میری سفارش کریں۔ مجھ میں چلنے کی سکت ہوتی۔ تو خود حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرتا لیکن معذور ہوں ضعف کے باعث دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔

نوجوان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو دیکھ کر ماں پر رقت طاری ہو گئی اور اس نے گلو گیر آواز میں کہا۔ بیٹا! میں نہ کہتی تھی، کہ حسن بصری کو نہ ستاؤ وہ اس عہد کا مظلوم ترین انسان ہے، اموی حکام نے اس پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے لیکن تم نے میری بات نہ مانی۔

ضعیفہ نوجوان کے مظالم کے پیش نظر حسن بصریؒ سے معافی طلب کرتے ہوئے گھبراتی تھی، لیکن بیٹے کی محبت اسے حسن بصری کی بارگاہ میں کھینچ لائی جب اس نے بیٹے کے لیے معافی طلب کی اور دعا کے لیے کہا تو حسن بصری

بولے کہ میری دعا تمہارے بیٹے کے حق میں ثابت نہیں ہو سکتی قبولیت اسی دعا کو ملتی ہے جس کا محرک محبت کا کوئی بے تاب جذبہ ہو میرے دل میں اس کی محبت نہیں، اسے کہو، جس سے محبت ہے اسی سے دعا کرائے۔

ضعیفہ حسن بصری کا پیغام لے کر بیٹے کے پاس پہنچی تو وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ شدت یاس میں بولا کہ اچھا میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، تو میری موت کے بعد میرے گلے میں رسی ڈال کر بازار میں گھسیٹنا اور لوگوں سے کہنا خدا کے مقبولوں کو ایذا دینے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے یہ کہنے کے بعد نوجوان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور اس کی تجہیز و تکفین کے لیے خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کا ایک کثیر اجتماع ہو گیا ضعیفہ نے بیٹے کی آخری آرزو کا اظہار کیا تو ان لوگوں نے کہا، کہ یہ خدا تعالیٰ کا مقبول انسان تھا اس کی لاش کے ساتھ تشہیر کا تصور بھی غلط ہے اسی رات حسن بصریؒ سوئے، تو انہیں خواب میں کہا گیا کہ آج ہمارے دوست کا انتقال ہو گیا ہے آپ جنازہ کے لیے کیوں نہیں گئے؟ حسن بصری نے پوچھا کون سا دوست؟ حکم ہوا کہ تمہاری ملازمہ کا بیٹا۔ حسن بصری بولے۔ میرا دشمن، میرے رب کا دوست کیسے بن گیا ارشاد باری ہوا، کہ جب اس نے آخری وقت تم سے رحم و کرم کی بھیک مانگی تھی اور تم نے اسے دھتکار دیا تھا تو وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اس نے ہمیں پکارا، اور ہم نے اس کی فریاد سن لی۔ اب وہ مردود نہیں مقبول ہے۔

خالدؓ اور ضرارؓ

حلب کے معرکے میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ جب غازیانِ اسلام حلب کے قلعہ کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑے تو رومیوں کی ساری توجہ جاسوسوں کے ذریعے ان کے حالات معلوم کرنے پر مرکوز تھی۔ رومی جاسوس رات کے وقت قلعہ سے باہر نکل کر اسلامی لشکر کا جائزہ لیتے۔ لیکن انہیں کوئی غافل نظر نہ آتا۔ رزم گاہوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھانے والے غازی رات کے وقت عبادتِ الٰہی میں مصروف نظر آتے۔ سالارِ لشکر ابو عبیدہؓ کا زیادہ تر وقت قرآن خوانی میں گذرتا اور یہ شب بیداری رومیوں کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی۔

ایک رات جاسوسوں نے رومیوں کو اطلاع دی کہ یہ وقت شب خون مارنے کے لیے نہایت موزوں ہے اس وقت اسلامی لشکر میں کافی غفلت کے آثار نظر آرہے ہیں۔ چنانچہ رومی لشکر نے یوقنا کے زیرِ قیادت نکل کر اچانک حملہ کیا اور اس حملہ سے مسلمانوں کو

بھاری نقصان پہنچا۔ خالدؓ بن ولیدؓ کی بصیرت اور ان کی غیر معمولی جنگی صلاحیتوں کے باعث اسلامی لشکر مزید نقصانات سے بچ گیا۔ انہوں نے رومیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور رومیوں کی توقع سے زیادہ انہیں ہزیمت بھی دی۔ لیکن بایں ہمہ رومی پچاس مسلمانوں کو پکڑ کر لے گئے۔ دن کے وقت رومیوں نے اسیر مسلمانوں کو زنجیروں میں جکڑ کر قلعہ کی دیواروں پر کھڑا کر دیا۔ اور ایک ایک کو مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شہید ہونے والے مسلمانوں کی استقامت رومیوں کے لیے حیرت انگیز تھی ہر غازی جان سپاری کے وقت اسی طمانیت کا اظہار کر رہا تھا۔ جو ایک مومن کا سرمایہ حیات ہوتی ہے۔ خالدؓ بن ولیدؓ اور ابو عبیدہؓ اس صورتِ حال سے بہت برہم ہوئے۔ اور خالد اپنے ایک ایک شہید کے خون کا انتقام لینے کے لیے بے قرار تھے خالد کے مشورے سے اسلامی لشکر کی حفاظت و صیانت کا مزید اہتمام کر لیا گیا۔

ایک دن رومیوں کو اطلاع ملی کہ اسلامی لشکر کا دستہ صبح کے وقت پیچھے کی طرف گیا تھا جو ابھی تک واپس نہیں آیا۔ رومی جاسوسوں نے کہا کہ ان کے ساتھ بار برداری کے اونٹ تھے جو اس امر کی علامت معلوم ہوتے ہیں۔ کہ مسلمان مفتوحہ علاقوں سے لشکر کے لیے رسد فراہم کرنے گئے ہیں۔ انہیں راستے میں گھیر کر تباہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ

رومی کمانڈار کی ہدایت کے مطابق ایک ہزار رومی سپاہیوں پر مشتمل فوج کا ایک دستہ رات کی تاریکی میں ان کی تلاش کے لیے نکل گیا۔ ان رومیوں نے مسلمانوں کو گھیر لیا۔ مسلمانوں نے جم کر مقابلہ کیا دو بیس کے قریب شہید ہو گئے اور باقی مجاہد رومیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے لشکر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ رومی دستہ قلعہ کے چور دروازے سے نکل کر پوشیدہ راستوں کے ذریعے مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تھا جس کا ابو عبیدہؓ اور ان کے ساتھیوں کو علم نہ ہو سکا۔ خالد اور ابو عبیدہؓ اس سوچ میں پڑے تھے کہ قلعہ کو محاصرہ میں لے لینے کے باوجود یہ کہاں سے نکل گئے ہیں۔ خالدؓ نے ابو عبیدہؓ سے کہا کہ خدا تعالیٰ کی تائید و نصرت جو میرے شامل حال ہے۔ اس پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ چور دروازہ سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے والے رومیوں کے لیے میں تنہا ہی کافی ہوں۔ میں ان کی تلاش میں جاتا ہوں۔ لیکن ابو عبیدہ کے مشورے سے خالد نے ایک فوجی دستہ ساتھ لے لیا۔ اسلامی لشکر سے دور ایک بستی جو مسلمانوں کے زیر نگیں آ چکی تھی، اس کے ساکنوں سے صورتِ حال معلوم کی گئی۔ تو انہوں نے بتایا کہ ہم میں سے کسی نے صلح کے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ یہ رومیوں کا فوجی دستہ تھا جو مسلمانوں

کو ہلاک کرنے کے بعد پہاڑی علاقے میں چھپ گیا ہے۔ خالدؓ بن ولید نے بستی والوں کی مدد سے رومی دستے کا سراغ لگانا شروع کیا۔ وہ گھوڑوں کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے ایک پناہ گاہ کے قریب پہنچ گئے اور خالد نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ نامعلوم پہاڑی مقام کی طرف پیش قدمی کرنے سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم اس جگہ سے چھپے رہیں رات کی تاریکی میں رومی پہاڑ سے نکل کر قلعہ کی طرف روانہ ہوں گے تو ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ خالدؓ نے اپنے فوجی دستے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کی قیادت ان کے اپنے ہاتھ میں تھی اور ایک قائد ضرارؓ بن ازور تھا۔

رات کی تاریکی میں جب رومی دستہ پہاڑ سے نکل کر حلب کے قلعہ کی طرف روانہ ہوا تو خالدؓ کمین گاہ سے نکل کر عقاب کی طرح حملہ آور ہوئے رومیوں نے گھبراہٹ میں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن ضرارؓ کا غیر متوقع حملہ ان کے لیے عذاب الٰہی ثابت ہوا۔

خالدؓ اور ضرارؓ کے عقابی حملے رومیوں کے لیے پیغام اجل ثابت رہے تھے۔ خالدؓ ابو عبیدہؓ سے یہ کہہ کر آئے تھے کہ وہ تنہا کافی ہوں گے۔ اور اب ان کے ساتھ ضرارؓ بھی تھے چنانچہ خالدؓ کی جانبازیوں سے سات سو رومیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور تین سو کو زندہ گرفتار کر کے

ابو عبیدہ کے پاس لے آئے وہ اپنے اس کارنامے کو ذاتی شجاعت و بہادری کا نتیجہ قرار دینے کی بجائے خدا تعالیٰ پر توکل تام کا نتیجہ قرار دے رہے تھے۔

محبت کی عطیّت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کے لیے حضورؐ کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ نبوت سے غایت درجہ قرب کے باعث انہیں جوتے والا تکیے والا اور وضو کے پانی والا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ القابات کو اپنے لیے سرمایۂ نازش و افتخار سمجھتے تھے۔ صحابہؓ کا یہ معمول تھا کہ انہیں حضورؐ زندگی میں ایک بار بھی محبت کے کسی لفظ سے یاد کر لیتے تو وہ اس لفظ کو جزوِ زیست بنا لیتے، ماں باپ کے عطا کردہ نام پر حضورؐ کا عطا کیا ہوا نام فوقیت لے جاتا۔ ابوہریرہؓ کے نام سے آج کون واقف ہے؟ بات اتنی سی تھی۔ کہ ان کے گرد بلیوں کو دیکھ کر حضورؐ نے انہیں پیار سے بلیوں والا کہہ دیا۔ اور وہ بلیوں والے بن گئے۔ ابوہریرہؓ کہلانے میں انہیں لذت محسوس ہونے لگی۔ محبت کی ہر ادا چونکہ مقبول ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں صحابہؓ بھی ابوہریرہؓ کہہ کر پکارنے لگے۔ احادیث میں بھی ان کی روایت ابوہریرہؓ کے نام سے ہونے لگی۔

بلیوں والا بظاہر کوئی اعلیٰ خطاب نہیں لیکن جس ذات کی زبان سے

یہ ملا تھا۔ وہ اعلیٰ تھی۔ اسی لیے۔ یہ بھی مقبول ہو گیا۔ مقبولیت کس چیز کی ہوئی؟
محبت کی، محبت کے عطیے کی، اس مقدس جذبے کی، جو محبت کی پیداوار
تھا۔ محبت جب عطا و بخشش پہ آمادہ ہوتی ہے۔ تو زر و جواہر ہی نہیں لٹاتی
پیار کے الفاظ سے بھی نوازتی ہے۔ اس کے لب و لہجے میں تصنع نہیں
ہوتا ہے اور محبت کی پکار میں بے ساختہ پن ہوتا ہے۔

ماں کا جذبۂ محبت جب عروج پہ ہوتا ہے۔ تو وہ بچے کو پیار کے الفاظ
سے یاد کرتی ہے۔ یہ الفاظ فصیح و بلیغ نہیں ہوتے۔ سیدھے سادے ہوتے
ہیں۔ بچہ بھی انہیں تو نہیں جانتا۔ وہ محبت کی زبان سمجھتا ہے۔ محبت
کی اداشناس ہوتی ہے۔ وہ زبان بھی سمجھتی ہے، اور کیفیات بھی، عقل نہ
زبان سمجھتی ہے، نہ کیفیات، وہ دونوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہے۔
الفاظ کی تراش خراش اور صناعی اس کا کام ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں
بے روح ہوتی ہیں۔

حضورؐ نے ایک بار حضرت علیؓ کے سرہانے کھڑے ہو کر دیکھا تو
وہ زمین پہ لیٹے تھے اور ان کے جسم پر مٹی لگی تھی۔ حضورؐ نے انہیں مٹی
والا کہہ کر اٹھایا۔ اسی دن سے علیؓ ابو تراب بن گئے

محبت کی فطرت ہے کہ وہ محبوب کو جس رنگ میں دیکھے نثار ہوتی
ہے۔ حضورؐ کے دل میں شفقت و محبت کا جذبہ حضرت علیؓ کی اس کیفیت

نے پیدا کیا جو ان پر مٹی لگنے سے طاری تھی۔ علیؑ کی یہی کیفیت بو تراب رض کے الفاظ بن کر نبوت کی زبان پہ آگئی۔ وہ اٹھے، اور ان کے ساتھ محبت کے کئی طوفان اٹھ کھڑے ہوئے۔

محبت کے طوفانوں کو محبت کی زبان سے بیدار کیا جا سکتا ہے نفرت میں یہ قوت نہیں۔ کہ وہ محبت کے کسی خفتہ جذبے کو بیدار کر سکے محبت خود بیدار ہے بیداری اسی کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ نفرت نہ خود بیدار ہے، نہ بیدار کر سکتی ہے حضرت ابوہریرہؓ نے زبان نبوت سے نکلا ہوا خطاب قبول کر لیا۔ تو یہ کیا تھا؟ یہ محبت کی بیداری ہی تو تھی۔ علیؓ ابن ابی طالب بوتراب بننے کے لیے تیار ہو گئے تو یہ بھی محبت ہی کی بیداری تھی۔ اور عبداللہ بن مسعودؓ جوتے والا کہلانے پر رضامند ہو گئے تو یہ بھی محبت ہی کی بیداری کا کرشمہ تھا۔ عقل جوتے والا کب کہلا سکتی ہے؟ اسے تو ایسے القابات سے عار محسوس ہوتی ہے۔ وہ جھکنا کب جانتی ہے۔ جھکنا اور محبوب کے ہر خطبے کو سینے سے لگانا تو صرف محبت کا شیوہ ہے۔ عقل سے بھولپن کے خطابات پائے بھی کب ہیں اسے تو عیّار اور مکاری کہا گیا ہے۔